تعلیم و تربیت
اپریل 2000ء

قسمت کا دھنی

سید نظر زیدی

اب سے کوئی چار سو برس پہلے کی بات ہے' پنجاب کے قصبے چنیوٹ میں شیخ عبداللطیف نام کے ایک نیک دل بزرگ رہتے تھے۔ ان شیخ صاحب کے گھر 1014ھ میں ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے علیم الدین رکھا۔ شیخ صاحب زیادہ امیر تو نہ تھے' لیکن دین دار بہت تھے۔ انہوں نے اپنے اس بیٹے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ عربی اور فارسی زبانیں پڑھانے کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی اور علم طب' یعنی علاج معالجے کی کتابیں بھی پڑھائیں۔

ہمارے آقا اور اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے "اللہ اپنے نیک بندوں پر علم القا کرتا ہے"۔

اس ارشاد مبارک کا مطلب ہے جو لوگ صحیح معنوں میں نیک ہوں انہیں وہ خاص باتیں آپ سے آپ معلوم ہو جاتی ہیں جو دوسروں کو موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر بھی معلوم نہیں ہوتیں۔ اسی کو مذہبی زبان میں القا کہا جاتا ہے۔

چنیوٹ میں پیدا ہونے والا یہ بچہ جس کا نام علیم الدین رکھا گیا تھا نیک ماں باپ کی اولاد ہونے کے ساتھ خود بھی بہت نیک تھا اور اس دوہری نیکی کی وجہ سے ایسا سمجھ دار اور قابل تھا کہ اس کے ساتھیوں میں اس جیسا کوئی نہ تھا۔ جو بات دوسروں کی سمجھ میں مشکل سے آتی تھی وہ بالکل آسانی سے سمجھ جاتا تھا اور پھر اسے یاد رکھتا تھا۔

بہت قابل اور بہت ہی نیک دل یہ علیم الدین جوان ہوا تو اس نے حکمت کا پیشہ اختیار کیا' وہ ایسا اچھا حکیم تھا کہ جو مریض اس کے مطب میں آتا تھا چند دنوں میں تن درست ہو جاتا تھا۔ لیکن چوں کہ اس زمانے میں چنیوٹ ایک معمولی سی بستی تھی اس لیے اسے زیادہ آمدنی نہ ہوتی تھی۔ بس تنگی ترشی سے گزارا ہو رہا تھا۔ لیکن اللہ کی خاص رحمت سے کچھ دن بعد ہی اس کی غربت بھی دور ہو گئی اور وہ ایسے اونچے رتبے پر پہنچ گیا کہ کم لوگوں ہی کو ایسی آسانی سے ایسا بڑا درجہ ملتا ہے۔

یہ پوری بات اس طرح ہے کہ افغانستان سے آنے والا سوداگروں کا قافلہ چنیوٹ کے قریب ٹھہرا اور اس میں جو سب سے بڑا سوداگر تھا وہ بیمار ہو گیا اور تکلیف ایسی بڑھی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ تکلیف بہت زیادہ بڑھی تو اس کے ساتھی کسی اچھے حکیم کی تلاش میں بستی میں آئے اور حکیم علیم الدین کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مریض کو بہت زیادہ تکلیف ہونے کے ساتھ اس کی بیماری بھی کچھ ایسی تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ' لیکن نوجوان حکیم ایک نظر دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ سوداگر کس مرض میں مبتلا ہے اور اس کے لیے ایسی دوا تجویز کی کہ ایک دو خوراکیں کھانے ہی سے وہ بھلا چنگا ہو گیا۔

بہت مایوسی کی حالت میں ایسی کامیابی حاصل ہو جائے تو دگنی خوشی حاصل ہوتی ہے' چناں چہ سوداگر اور اس کے ساتھی بھی بہت خوش ہوئے اور اچھا خاصا انعام دینے کے ساتھ حکیم علیم الدین کو مشورہ دیا: "تم ہمارے ساتھ دارالحکومت آگرہ چلو' امید ہے وہاں تمہاری قسمت کا ستارہ چمکے گا۔ اس چھوٹی سی بستی ہی میں رہے تو کون تمہاری قدر کرے گا"۔

یہ مشورہ بہت اچھا تھا۔ حکیم علیم الدین نے فوراً قبول کر لیا اور سوداگروں کے قافلے کے ساتھ آگرہ چلا گیا۔

اس زمانے میں مغلیہ خاندان کا مشہور شہنشاہ نورالدین جہاں گیر حکومت کر رہا تھا اور اس کے دارالحکومت شہر آگرہ کو ایسی رونق اور خوش حالی حاصل تھی کہ پورے علاقے میں دنیا

کوئی اور شہر نہ تھا۔ سوداگر کی امداد سے حکیم علیم الدین نے ایک جگہ مطب کھول لیا اور مریضوں کا علاج کرنے لگا۔ چنیوٹ کے مقابلے میں اس کی آمدنی بہت بڑھ گئی' لیکن پھر بھی وہ ایک عام حکیم ہی تھا۔ اس عظیم شہر میں بڑے بڑے نامی گرامی حکیم مطب کر رہے تھے' لیکن اللہ کے بھید نرالے ہیں۔ جب وہ کسی کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو غیب سے اس کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اس پردیسی حکیم کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔

جہاں گیر کی ملکہ نور جہاں اچھی بھلی تھی کہ اچانک اس کے پاؤں کے تلوے میں پھوڑا نمودار ہوا اور اس کی تکلیف سے ملکہ کا برا حال ہو گیا۔ فوراً شاہی طبیب اور جراح بلوائے گئے۔ انہوں نے کئی بار پیر کا معائنہ کیا اور آخر میں یہ رائے قائم کی کہ نشتر سے پھوڑے کو چیر ڈالا جائے۔ اس عمل سے زہریلا مادہ نکل جائے گا اور ملکہ صاحبہ تن درست ہو جائیں گی۔ طبیبوں اور جراحوں کی یہ متفقہ تجویز ملکہ کے سامنے رکھی گئی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا "ہم ہرگز ہرگز یہ اجازت نہ دیں گے کہ ہمارے پیر کو زخمی کیا جائے' ان طبیبوں اور جراحوں کو چاہیے کہ کوئی اور علاج تجویز کریں"۔

حکم رانوں کی ضد مشہور ہے' ملکہ نور جہاں تو ویسے بھی بہت بڑا دبدبہ رکھتی تھیں' تاریخ لکھنے والے عالموں نے بتایا ہے ملک میں اسی کا حکم چلتا تھا۔ بادشاہ کو معلوم ہوا کہ ملکہ نشتر سے چیر اگلوانا نہیں چاہتیں تو اس نے بھی فیصلہ سنا دیا۔ "طبیب اور جراح کوئی اور مناسب علاج ڈھونڈیں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو انہیں سخت سزا دی جائے گی"۔

بادشاہ کا یہ فیصلہ سنا تو سب طبیب اور جراح پریشان ہو گئے۔ ملکہ کے پیر پر جو خطرناک پھوڑا نکلا تھا' اس کا آخری علاج یہی تھا کہ نشتر سے چیر کر اس کا زہریلا مواد نکال دیا جائے۔ اس پریشانی کی حالت میں کسی کو حکیم علیم الدین کا خیال آیا جس کی شہرت بڑھ رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے یہ بات بادشاہ سے کہی گئی کہ اس نئے حکیم سے بھی مشورہ کر لیا جائے جو پنجاب سے آیا ہے۔ بادشاہ نے یہ بات فوراً مان لی' چناں چہ اسی وقت اسے بلایا گیا اور اس نے ملکہ کا پاؤں دیکھ کر اطمینان بھری آواز میں کہا۔

"اگر ملکہ صاحبہ میری بتائی ہوئی تدبیر پر عمل کریں تو ان شاء اللہ ان کا مرض بہت جلد دور ہو جائے گا"۔

اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں' حکیم علیم الدین نے یہ خوش خبری سنائی تو ملکہ نور جہاں نے یہ بات فوراً مان لی کہ حکیم صاحب جو طریقہ بتائیں گے ہم اس پر عمل کریں گے۔ یہ بات طے ہو گئی تو حکیم علیم الدین نے شاہی محل کے خادموں کو حکم دیا۔ "محل کے صحن میں اتنا ریت بچھا دیا جائے جس میں آدمی کے پیر دھنس جائیں"۔

یہ کام فوراً کر دیا گیا' لیکن سب حیران تھے کہ ایسے خطرناک مرض کا یہ کیسا علاج ہے۔ شاہی طبیبوں نے دبے دبے لفظوں میں یہاں تک کہا کہ یہ شخص ناحق وقت ضائع کر رہا ہے۔ ملکہ صاحبہ کو چاہیے ہماری بات مان لیں' لیکن نوجوان حکیم نے لوگوں کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کی۔ جب ریت کا فرش بچھ گیا تو ملکہ سے کہا۔ "حضور' اب یہ تکلیف گوارا کریں کہ جوتے اتار کر ننگے پاؤں صحن کے ایک سرے سے دوسرے تک جائیں"۔

یہ انوکھا علاج ملکہ کی سمجھ میں بھی نہ آ رہا تھا' لیکن چوں کہ حکیم کو علاج کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی اس لیے خاموش رہی اور ننگے پاؤں صحن کے ایک سرے سے چل کر دوسرے سرے تک پہنچ گئی۔ ادھر جب ملکہ آدھے صحن تک پہنچی تو حکیم جلدی سے آگے بڑھا اور جھک کر ان نشانوں کو دیکھنے لگا جو ریت پر بن گئے تھے اور پھر اپنی جگہ آ گیا اور ملکہ سے دوسری درخواست کی۔ "ملکہ عالیہ' اب حضور اپنے پیروں کے نشانوں پر پیر رکھتی ہوئی ایک بار اور صحن کے اس سرے سے اس سرے تک تشریف لے جائیں"۔

ملکہ نے یہ بات بھی مان لی اور جب وہ صحن کے دوسرے سرے پر پہنچی تو اسے یوں لگا جیسے پیر کا شدید درد قریب قریب ختم ہو گیا ہے۔ اس نے بیٹھ کر اپنے پاؤں کا تلوا دیکھا تو پھوڑا بھی غائب ہو چکا تھا۔ وہ خوشی بھری آواز میں چلائی۔ "واہ حکیم صاحب واہ! ہم تو واقعی صحت مند ہو گئے ہیں۔ جس درد کی وجہ سے ہماری جان نکلی جا رہی تھی اب بالکل نہیں

ہے"۔

ملکہ کا یہ کہنا تھا کہ پورے شاہی محل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شادیانے بجنے لگے۔ حکیم علیم الدین نے آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا اور ملکہ کے پاؤں کو صاف کر کے مرہم لگاتے ہوئے کہا۔ "ملکہ عالیہ، حضور کی یہ تکلیف میری قابلیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ پاک کی خاص مہربانی سے دور ہوئی ہے۔ ان شاء اللہ حضور دو چار دن میں پوری طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گی اور اللہ چاہے گا تو پھر ایسی تکلیف کبھی نہ ہو گی"۔

بادشاہ یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ملکہ کو مطمئن اور خوش دیکھا تو حکم دیا۔ "اس قابل حکیم کو اسی وقت ایک لاکھ روپے بطور انعام دیئے جائیں۔ بادولت اس بات سے بہت خوش ہوئے ہیں کہ اس نے پلک جھپکنے میں ملکہ عالیہ کو ایسے مرض سے نجات دے دی جس کا علاج شاہی طبیبوں کے نزدیک ان کے پیر کو نشتر سے زخمی کرنا تھا"۔

بادشاہ کی بات ختم ہوئی تو ملکہ نے بہت خوش ہو کر کہا۔ "حکیم صاحب نے جس طرح بالکل آسانی سے ہماری بیماری ختم کر دی ہے یہ واقعی ان کا کمال ہے۔ قدردانی کے طور پر ہم اپنے وہ سب زیور انہیں دے رہے ہیں جو اس وقت پہنے ہوئے ہیں"۔

یہ بات کہتے ہوئے ملکہ نے سونے کے وہ زیور جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے، اتارنے شروع کر دیے اور اس کے ساتھ ہی ان سب خواتین نے بھی جو اس وقت وہاں موجود تھیں، اپنے اپنے زیور اتار کر خوش قسمت حکیم کو دے دیے۔ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے دیے گئے ایک لاکھ اور ان زیوروں کی قیمت ملا کر رقم بائیس لاکھ روپے بن گئی۔ ان بائیس لاکھ روپوں کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہیے کہ اس زمانے میں ایک روپے کا ایک من آٹا مل جاتا تھا۔

یہ بھاری انعام ملنے کے علاوہ بادشاہ نے ایک اور احسان غریب خاندان سے تعلق رکھنے والے اس حکیم پر یہ کیا کہ پنج ہزاری کے منصب پر فائز کر کے اسے اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔

آن کی آن میں حکیم علیم الدین کو جو دولت اور جو منصب مل گیا تھا وہ اس کی تمناؤں سے زیادہ تھا، لیکن آگے چل کر اللہ پاک نے اسے اس سے بھی بڑا رتبہ بخشا۔ جہاں گیر کے بعد شاہ جہاں ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تو اس نے اس قابل طبیب کو وزیر خاں کا لقب دے کر پنجاب کا گورنر بنا دیا اور بہت زیادہ حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ حکیم علیم الدین عرف وزیر خاں کی ترقی پنجاب کا گورنر بننے ہی پر نہ رک گئی، بلکہ اپنے نیک بندوں پر بہت ہی مہربانیاں کرنے والے اللہ نے اسے ایک اور ایسی عزت بخشی کہ رہتی دنیا تک اس کا نام زندہ رہے گا اور اسے بے حساب ثواب ملتا رہے گا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ امیر ہوتے ہیں وہ اپنی شان بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ عیش آرام حاصل کرنے کے دھندوں میں لگ جاتے ہیں، لیکن حکیم علیم الدین نے اتنا امیر کبیر اور پنجاب جیسے صوبے کا گورنر بن جانے کے بعد زیادہ توجہ اپنے دین اسلام کی ترقی اور لوگوں کی بھلائی کے کاموں کی طرف دی اور ان بہت سارے اچھے کاموں میں سے ایک بہت ہی اچھا کام یہ ہے کہ لاہور اور اپنے قصبے چنیوٹ میں دو عالی شان مسجدیں تعمیر کرائیں۔ یہ مسجدیں خدا کے فضل سے اب بھی اپنی اصل صورت میں باقی ہیں۔ ان میں پانچوں وقت باجماعت نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور ان کے بانی کو روزانہ ڈھیروں ثواب ملتا ہے۔

لاہور کی تاریخی مسجد، مسجد وزیر خاں اسی نواب وزیر خاں کی بنوائی ہوئی ہے اور یہ ایسی شان دار ہے کہ اسے اسلامی دنیا کی خاص مسجدوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ مضبوطی اور خوب صورتی میں یہ مسجد ایک خاص شان رکھتی ہے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اپنی اصلی حالت میں ہے۔ اس کی محراب، دیواروں، گنبدوں اور میناروں پر بہت ہی خوش نما رنگوں میں جو گل بوٹے بنائے گئے تھے اور جو شعر اور قرآنی آیتیں لکھی گئی تھیں اس طرح بہار دکھا رہی ہیں گویا یہ مسجد کچھ ہی عرصہ پہلے تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بہت ہی خاص بات اس کا طرز تعمیر

ہے۔ اس فن کے ماہر دل کھول کر اس کی تعریف کرتے ہیں۔

یہ شان دار تاریخی مسجد لاہور کے دہلی دروازے کے اندر ہے۔ اس دروازے سے داخل ہو کر تھوڑی دور چلیں تو ایک چوک آتا ہے جو اس مسجد کی مناسبت سے چوک وزیر خاں کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے جب یہ مسجد تعمیر ہوئی تھی تو نواب وزیر خاں نے آس پاس کی دکانیں اور مکان اس کے لیے وقف کر دیئے تھے۔ بعد کے زمانوں میں لوگوں نے ان پر قبضہ کر لیا۔ بس گنتی کی چند دکانیں رہ گئی ہیں جن کے کرائے سے مسجد کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ پاکستان کا محکمہ اوقاف بھی اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ چنیوٹ کی مسجد کو لوگ شاہی مسجد کہتے ہیں۔ یہ بھی بہت کشادہ اور شان دار ہے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس قابل حکیم نے ملکہ کا علاج کس طرح کیا تھا۔ کیوں کہ ریت کے فرش پر ننگے پاؤں چلنا تو اس خطرناک پھوڑے کا علاج نہ ہو سکتا تھا۔ جب کہ اس کا علاج مغلیہ سلطنت کے نامی گرامی طبیب اور جراح نہ کر سکے تھے۔ اس بارے میں بتایا گیا ہے کہ حکیم علیم الدین نے پھوڑے کا علاج تو یہی کیا تھا کہ نشتر سے ملکہ کے تلوے کی کھال کاٹ کر مواد نکالا تھا، لیکن اپنی خداداد ذہانت سے ترکیب ایسی نکالی تھی کہ اپریشن بھی ہو گیا تھا اور ملکہ کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی تھی اور نہ اس نے کسی طرح کی تکلیف محسوس کی تھی۔ وہ تدبیر یہ تھی کہ ریت کے فرش پر ملکہ کے پیروں کے جو نشان بنے تھے ان میں سے ایک نشان کی اس جگہ چھوٹا سا نشتر چھپا دیا تھا جہاں پھوڑے کے ابھار کی وجہ سے کچھ گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ ملکہ ان نشانوں پر پاؤں رکھتی ہوئی دوبارہ صحن کے دوسرے کنارے تک گئی تو نشتر پھوڑے میں چبھ گیا اور اس کا زہریلا مواد خارج ہونے سے وہ درد ختم ہو
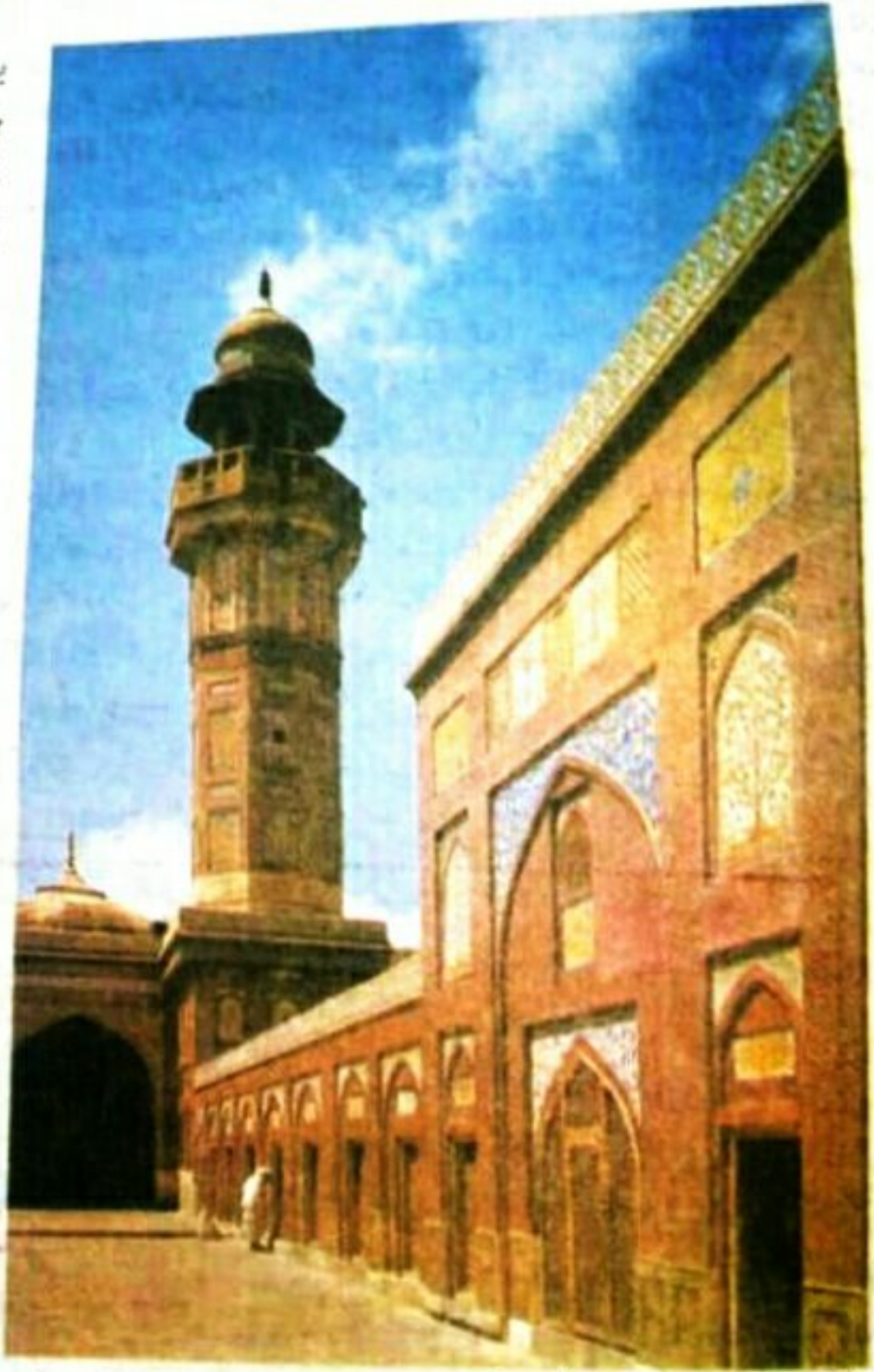
گیا جس کی وجہ سے وہ سخت بے چین تھی۔

یہ کہانی پڑھتے ہوئے بچوں کو اندازہ ہوا ہوگا کہ حکیم علیم الدین نے بھی پھوڑے کا علاج تو وہی کیا جو شاہی طبیبوں اور جراحوں نے بتایا تھا۔ لیکن طریقہ ایسا اختیار کیا جو اللہ کی خاص مہربانی سے ہی اس کے ذہن میں آیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ عقل کی سچی روشنی انسان کو اللہ کی مہربانی ہی سے حاصل ہوتی ہے اور یہ روشنی ان لوگوں کو ضرور بخشی جاتی ہے جو نیکی اور سچائی کے راستے پر چلنے کا پکا ارادہ کر لیں۔ اسی روشنی کا نام ایمان کا نور ہے۔

چنیوٹ

دریائے چناب کے مشرقی کنارے پر آباد یہ ضلع جھنگ کی ایک تحصیل ہے۔ چنیوٹ شہر کی آبادی اب تقریباً ڈیڑھ لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ شہر لکڑی کے کاری گروں کے نفیس کام کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ دنیا بھر سے سیاح خصوصی طور پر اس کام کو دیکھنے یہاں آتے ہیں۔ یہاں کی ایک مشہور عمارت گل زار منزل قابل دید ہے۔ اس عمارت کو چنیوٹ کی شیخ برادری کے ایک تاجر سیٹھ عمر حیات نے اپنی بیوی فاطمہ کی یاد میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ عظیم الشان عمارت 5 منزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ عمارت مغلیہ طرز تعمیر کے انداز میں بنائی گئی ہے جس میں خوب صورت جھروکوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اس عمارت میں 30 کشادہ کمرے ہیں اور ہر منزل میں 25 سیڑھیاں ہیں۔ 1990ء میں اس عمارت کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ اب اس میں ایک بہت بڑی لائبریری قائم کروی گئی ہے۔ اس لائبریری کا نام اس کے بانی کے نام کی نسبت سے "عمر حیات لائبریری" رکھ دیا گیا ہے۔

چنیوٹ شہر کی سب سے قابل دید عمارت شاہی مسجد ہے یہ قدیم مسجد بہت عالی شان اور قابل دید ہے۔

وطن کے محافظ

نجمہ معراج

نبیل بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور نہایت شرارتی تھا۔ وہ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ان کے گھرانے کا شمار متوسط گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ان کے ابو اور امی کو صاف ستھرے گھر بہت پسند تھے۔ اسی لیے وہ اپنے گھر میں بھی صفائی کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ نبیل کی امی نے گھر کے ہر کمرے میں ڈسٹ بن رکھے ہوئے تھے۔ کہنے کو تو وہ کوڑا کرکٹ ڈالنے کی ٹوکریاں ہی تھیں مگر نبیل کی امی نے انہیں بھی خوب سجا رکھا تھا۔ گھر میں کوئی چیز بکھری پڑی ہونا تو دور کی بات تھی' اس کی امی تو گھر کے صحن میں موجود پھولوں کی چھوٹی سی کیاری میں گرے ہوئے پتوں تک کو برداشت نہ کرتی تھیں۔

نبیل ذہین تو تھا ہی مگر پرلے درجے کا شرارتی بھی تھا۔ جہاں اس میں شرارت اور ذہانت کی دو خصلتیں موجود تھیں وہاں اس میں دو خامیاں بھی تھیں۔ ایک تو وہ صفائی پسند نہیں تھا اور گھر میں گند بہت ڈالتا تھا۔ دوسری یہ کہ وہ بڑا ہٹ دھرم تھا اور کسی کی بات نہیں مانتا تھا۔

اس کی امی کو نبیل کی یہ دونوں عادتیں بہت ناپسند تھیں۔ وہ جب بھی کھانے کی میز پر آتا' کھانا کھاتے یا ناشتا کرتے وقت بہت گند ڈالتا۔ اس کی امی منع ہی کرتی رہتیں کہ نبیل یہ نہ کرو وہ نہ کرو مگر وہ صفائی ستھرائی کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا قطعاً خیال نہ رکھتا۔ کپڑوں والی الماریوں میں سے کوئی ایک چیز ڈھونڈتے ہوئے تہ در تہ رکھے سارے کپڑے الٹ پلٹ دیتا۔ بستر پر بیٹھتا تو بستر کی چادر اور تکیے کا جو حشر ہوا ہوتا وہ دیکھنے والا ہوتا۔

اس کی امی اسے ان حرکتوں سے ہمیشہ روکتی ٹوکتی رہتیں اور اکثر یہ بھی کہتیں کہ اگر حنا' وحید اور نوید بھی ایسے ہوتے تو میرا جینا دو بھر ہو جاتا۔ نبیل اپنی عادتیں بدلنے کے بجائے الٹا ان لوگوں سے ناراض ہو جاتا جو اسے اس کی ان عادتوں سے روکتے۔ وہ گھر میں بھی جب کوئی پھل کھاتا تو اس کے چھلکے زمین پر ہی پھینک دیتا۔ اگر کوڑے والی ٹوکری ساتھ پڑی بھی ہوتی تو وہ اتنی زحمت نہ کرتا کہ چھلکے نیچے گرانے کے بجائے اسی میں ڈال دے۔

چھٹی کے دن وہ اکثر کینو کیلے وغیرہ صحن میں بیٹھ کر کھاتا چھلکے کوڑے والی ٹوکری میں ڈالنے کے بجائے ایک جگہ بھی نہ رکھتا تھا بلکہ کوئی چھلکا اس کے آگے' کوئی دائیں اور کوئی بائیں طرف پڑا ہوتا تھا۔ جب اسے اس گھر کے بڑے منع کرتے تو اسے یہ بہت برا لگتا۔ اگر وہ اپنے دوستوں کو گھر لا کر کھیلتا تو سارے گھر میں کاغذ ہی کاغذ بکھیر دیتا۔ اس کی امی اسے بہت ڈانتیں مگر اس پر اپنی امی کی ڈانٹ ڈپٹ کا خاطر خواہ اثر نہ ہوتا۔ بلکہ اب تو وہ گندگی سے منع کرنے پر چڑ سا جاتا تھا۔ کوئی منع کرتا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ گند ڈالنے لگ پڑتا۔ جب کہ اس کی امی کو گھر میں کوڑا کرکٹ بکھرا دیکھ کر بہت کوفت ہوتی۔

یہ جمعرات کا دن تھا اور مارچ کی 23 تاریخ۔ نبیل کے

اسکول میں آج یوم پاکستان منایا گیا۔ سارا دن تقریری مقابلے، ملی نغمے اور بیت بازی کے مقابلے ہوتے رہے۔ آج نبیل کو ہوم ورک نہیں ملا تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ عصر کی نماز کے بعد قریبی پارک میں سیر کے لیے جائے گا اور ہمراہ کچھ پھل بھی ساتھ لے گا۔

پھر وہ اپنی امی کو بتا کر اپنے دوستوں کے ہمراہ سیر کے لیے چلا گیا۔ سیر کی خوشی اور جلدی میں اس نے دوپہر کا کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا تھا۔ پارک میں تھوڑی دیر کھیلنے کودنے کے بعد اس کو بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے چلتے چلتے ہی کیلے کھانے شروع کر دیے۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی پھل کھانے کی دعوت دی جو انہوں نے بخوشی قبول کر لی۔ نبیل کیلے کھاتے ہوئے چھلکے لاپروائی سے زمین پر ہی پھینکتا جا رہا تھا جب کہ اس کے دوست چھلکوں کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے تاکہ جہاں کہیں ڈسٹ بن نظر آئے گی اس میں ڈال دیں گے۔ وہ سب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ پھولوں کی ایک کیاری کے پاس سے گزرے تو نبیل کے دوستوں کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ اس شخص کی عمر کوئی 40'45 سال کے لگ بھگ ہو گی۔ اس نے سفید سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پھولوں کی کیاری کے پاس نرم نرم گھاس پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا پارک میں ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ نبیل جب اس شخص کے پاس سے گزرا تو بے دھیانی میں اس نے کیلے کا چھلکا نیچے گرا دیا جو اس شخص کی جھولی میں جا گرا۔

نبیل کے ایک دوست نے اس شخص سے فوراً معذرت کی۔ اس نے معذرت قبول کرنے کے بجائے ان سب کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اب انہیں اس بات کا خوف محسوس ہونے لگا کہ نہ جانے یہ شخص ان کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ مگر اس شخص نے بڑے نرم لہجے میں انہیں سمجھایا "بیٹا آپ سے میرے اوپر چھلکا گر گیا ہے تو کوئی بات نہیں لیکن کوئی بھی چیز کھا کر اس کے چھلکے زمین پر نہیں پھینکتے۔ بلکہ ہر قسم کے کوڑے کرکٹ کو اس کی اصل جگہ پر پہنچانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ گھر صاف کرو تو کوڑا گلی میں پھینک دو اور اگر اسکول صاف کرو تو اس کا کوڑا بھی اسکول کے باہر ہی سڑک پر پھینک دو۔ ہم جب اپنے اسکول یا گھر کو صاف کر رہے ہوتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسکول یا گھر ہی ہمارا ہے۔ حال آں کہ اسکول یا گھر تک پہنچنے کے لیے ہمیں انہیں گلیوں اور بازاروں سے گزرنا ہوتا ہے جن کو ہم کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے بھر دیتے ہیں یا گندے پانی کے جوہڑوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ صرف یہ گھر ہمارا ہے یا صرف یہ اسکول ہمارا ہے ہم نے صرف اسی کو صاف ستھرا رکھنا ہے۔ یہ سوچنا چاہیے کہ سارا ملک بلکہ کل جہاں ہمارا ہے اور ہم نے اس پوری دنیا کو صاف ستھرا رکھنا ہے"۔

پھر اس شخص نے ان بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا' یہ اسکول اور گھر ہی آپ کا نہیں' یہ سارے پارک' یہ شہر' یہ سڑکیں اور یہ ملک آپ ہی کا ہے۔ اس کو صاف ستھرا رکھنا ہر شہری کا فرض ہے۔ آج 23 مارچ ہے اور اسی دن 1940ء کو مسلمانوں نے اپنا الگ وطن حاصل کرنے کی قرارداد پاس کی تھی جو اس وقت قرارداد لاہور اور بعد میں قرارداد پاکستان کہلائی۔ پھر اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمارے بڑوں نے بہت سی قربانیاں دیں۔ تب کہیں جا کر ہمیں یہ پیارا وطن پاکستان ملا۔ آج ہم 23 مارچ کا دن یوم پاکستان کے نام سے مناتے ہیں۔ بلاشبہ اس وطن کی حفاظت کرنا اب ہمارا فرض ہے۔ مگر اس کی حفاظت صفائی کا خیال رکھے بغیر نہیں ہو سکتی"

یہ سن کر نبیل حیران سا ہو گیا۔ ذہین تو وہ تھا ہی لہٰذا اس نے اس شخص سے پوچھا "یہ بھلا صفائی کا وطن کی حفاظت سے کیا تعلق؟ میرے خیال میں تو سرحد کے ساتھ ساتھ گندے پانی کے جوہڑ بنا دینے چاہئیں۔ جو بھی ہمارے ملک کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے یہ جوہڑ اس کے سارے جسم کو میلا کر دیں" نبیل نے شرارتی لہجے میں کہا۔

"بیٹا' کسی بھی ملک کی حفاظت جوہڑ یا ہتھیار نہیں ہمیشہ اس ملک میں بسنے والے لوگ کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ماحول کو گندا رکھیں گے تو پھر اس گندگی سے بیماریاں پھیلیں گی جس سے ہم بیمار ہو جائیں گے۔ آپ تو خوب جانتے ہیں کہ بیمار قوم تو نہیں ناں لڑ سکتی۔ لڑنے کے لیے تو تن درست' صحت مند اور

خوب طاقت ور ہونا ضروری ہوتا ہے"۔

"باباجی رہنے دیں۔ یہ نصیحتیں اپنے پاس ہی رکھیں۔ ان نصیحتوں ہی سے بچ کر تو میں گھر سے نکلا تھا۔ ادھر آپ مل گئے ہیں۔ رکھیں اپنے ملک کو خود ہی صاف" نبیل نے ان باتوں سے اکتاتے ہوئے کہا اور پیچھے مڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا "چلو بھائی' آؤ چلیں۔ یہاں مزید ٹھہرے تو یہ باباجی ہماری سیر کا مزا کرکرا کر دیں گے"۔

اس شخص نے جب نبیل کو اس لہجے میں بات کرتے سنا تو حیران پریشان بیٹھا نبیل کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بہرحال نبیل اور اس کے دوستوں نے پارک کی خوب سیر کی اور انہوں نے سارے پارک کو دو تین بار گھوم مارا۔

شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ چھا رہا تھا۔ نبیل اور اس کے ساتھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پارک سے گزر رہے تھے کہ بے دھیانی میں نبیل کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر آگیا۔ وہ دھڑام سے منہ کے بل گرا اور زور سے چلایا "ہائے اللہ' میری ٹانگ"

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس وقت وہی شخص پارک کی سیر کے بعد ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اس شخص نے جلدی سے نبیل کو بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور چلنے کے لیے کہا لیکن وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ اور اس سے ذرا سا بھی چلا نہیں جا رہا تھا۔ شاید اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ پہلے تو نبیل درد کی شدت سے چیخ رہا تھا مگر تھوڑی دیر چیخنے کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ شخص اور نبیل کے دوست اسے اٹھا کر پارک کے صدر دروازے تک لے آئے۔ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ خوش قسمتی سے باہر اسی شخص کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے نبیل کو گاڑی میں بٹھایا اور ہسپتال لے گیا۔

اس کے دوست بھی ہسپتال پہنچ گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے نبیل کو فوراً ٹیکے وغیرہ لگائے جس سے نبیل ہوش میں آگیا۔ اب اس کے درد میں بھی کمی تھی۔ پھر ڈاکٹروں نے معاینہ کرنے کے بعد بتایا کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے۔ اس شخص نے نبیل کے دوستوں سے اس کے گھر کا ٹیلی فون پوچھا اور اس کے امی ابو کو فون کر کے بتادیا۔ نبیل کے والدین جلد ہی پہنچ گئے۔ وہ شخص انہیں خدا حافظ کہ کر چلا گیا۔

نبیل کو چند روز ہسپتال میں ہی رکنا پڑا۔ پھر جب وہ گھر آیا تو اس کی ٹانگ پر پلستر لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ نبیل اب اس شخص کی نصیحتوں پر عمل نہ کر کے پچھتا رہا تھا۔ اس نے اپنی امی کو پارک میں پیش آنے والا سارا واقعہ بتا دیا۔

اتنے میں نبیل کی امی بولیں "بیٹا آپ کو میری نصیحتیں بری لگتی تھیں ناں' اب آپ کو اپنی ان بری عادتوں کی وجہ سے دیکھو کتنی بڑی سزا ملی ہے"۔

"جی امی جان' یہ مجھے واقعی اپنے کیے کی سزا ملی ہے ورنہ اس چھلکے سے کوئی اور بھی تو پھسل سکتا تھا۔ اب میں آیندہ اپنا گھر ہی نہیں بلکہ جس جگہ بھی رہوں گا اس جگہ کی صفائی کا خیال رکھا کروں گا۔ مجھے اب پتا چلا ہے کہ صرف ہمارا گھر ہی ہمارا نہیں بلکہ یہ ملک بھی ہمارا ہے۔ ہمیں سارے ملک کی صفائی کا خیال رکھنا چاہیے"۔

پھر نبیل سوچنے لگا "وہ شخص بہت عقل مند تھا اور محب وطن بھی۔ واقعی گندگی ملک کی دشمن ہے اور صفائی وطن کی محافظ۔ اگر میں بڑا ہو کر فوج میں بھرتی ہونا چاہوں تو یقیناً مجھے اس ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی وجہ سے نااہل قرار دے دیا جائے گا اور یہ سب کچھ میرے گند ڈالنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اب اس شخص کی باتوں کو صحیح طور پر سمجھ پایا ہوں۔ اب مجھے علم ہوا ہے کہ صفائی وطن کی محافظ ہوتی ہے مگر اب سمجھنے کا کیا فائدہ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔

پھر اس نے کہا "امی جان' میں بڑوں کی نصیحتیں غور سے سنا کروں گا اور ان پر عمل بھی کیا کروں گا"۔

نبیل کی امی اپنے منے سے بیٹے کی ایسی اچھی اچھی باتیں سن کر بہت خوش ہوئیں۔ انہیں اپنے بیٹے کے چوٹ لگنے کا بہت دکھ تھا مگر انہیں اس بات کی خوشی اس سے بھی زیادہ ہوئی کہ ان کا بیٹا راہ راست پر آگیا ہے۔ اس کی امی نے نبیل کا ماتھا چوم لیا اور اسے خوش ہو کر ٹانگ جلد صحیح ہو جانے کی دعا دی اور جب وہ صحت یاب ہو کر گھر آیا تو اس کی بہن حنا اور بھائیوں وحید اور نوید نے اسے خوشی سے پھول پیش کیے۔

چاچو چاند بنے بھوت

محمد معروف چشتی

آج چھٹی کا دن تھا۔ کافی دن دھند چھائے رہنے کے بعد آج دھوپ نکلی تھی۔ اس لیے قاسم اور عاصم دونوں بھائیوں کا پتنگ اڑانے کو بڑا جی چاہ رہا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہمیشہ کی طرح انہوں نے اپنا جیب خرچ ختم کر لیا تھا، اس لیے پتنگیں نہیں آسکتی تھیں۔ دوسرا مسئلہ ابو جان سے اجازت لینے کا تھا۔ کیوں کہ وہ پتنگ بازی پسند نہیں کرتے تھے۔ دونوں اسی مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ عاصم بولا:

"قاسم بھائی، چاچو چاند کے ہوتے ہوئے بھلا ہمیں کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ ابھی چاچو کو چل کر ساتھ لیتے ہیں پھر دیکھنا مسئلے کس طرح حل ہوتے ہیں"۔ اور پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ کیوں کہ عاصم، قاسم اور چاچو چاند کا ایک ہی کمرا تھا اور چاچو ابھی تک بستر میں پڑے تھے۔

چاچو چاند ان کے سگے چاچو تھے۔ مگر چاچو کا بچپن کا نام ایسا پکا ہوا کہ بڑے ہو کر بھی وہ چھوٹوں کے لیے بھی چاند ہی رہے۔ وہ قاسم اور عاصم سے چند سال ہی بڑے تھے۔ عاصم اور قاسم اسکول میں اور چاچو ابھی تک کالج میں پڑھتے تھے۔ اس لیے ان کی خوب دوستی تھی۔ چاچو خود کو بہت ذہین اور عقل مند سمجھتے تھے مگر تھے بڑے احمق۔ دونوں بھائیوں کو جب بھی چاچو سے کوئی کام لینا ہوتا چاچو کو خوب مکھن لگاتے اور کام نکلوا لیتے۔

چناں چہ اب جب انہیں پتنگ اڑانے میں کچھ رکاوٹیں محسوس ہوئیں، وہ فوراً چاچو کے پاس پہنچے۔

"ارے چاچو، آپ ابھی تک آرام کر رہے ہیں۔ باہر نکل کر دیکھیں کتنی پیاری دھوپ نکلی ہوئی ہے"۔ قاسم نے کمرے میں آکر چاچو چاند سے کہا جو ابھی تک گرم بستر کے مزے لوٹ رہے تھے۔

"آج تو پتنگ بازی کا موسم ہے" عاصم بولا۔

"ارے بھتیجے، کبھی کوئی کام کی بات بھی کر لیا کرو۔ پتنگ بازی بھی کوئی کھیل ہے بھلا" چاچو نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے، رے رے رے چاچو، یہ آپ نے کیا کہہ دیا"۔ قاسم نے دیدے پھاڑ کر نہایت حیران ہونے کی اداکاری کی۔ "پتنگ بازی تو بڑا تاریخی کھیل ہے۔ سنا ہے پتھر کے زمانے میں بھی انسان پتنگ اڑاتے تھے اور ڈور کے بجائے اپنے لمبے لمبے بال باندھ کر ڈور بنا لیا کرتے تھے" قاسم نے گپ چھوڑ دی۔

"اچھا کیا واقعی؟" چاچو نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں تو اور کیا! اسی لیے تو وہ اتنے لمبے بال رکھتے تھے۔

ورنہ فوجی کٹ نہ کروا لیتے"۔

"اور اس کے فائدے بھی بہت ہیں" عاصم نے کہا۔

"مجھے بھی بتاؤ کیا فائدے ہیں؟" چاچو نے عینک لگاتے ہوئے کہا۔

عاصم بولا "اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ..... وہ تو میں بھول گیا.... ہاں البتہ اس کا دوسرا فائدہ سنیے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ..... وہ..... وہ قاسم کو پتا ہوگا۔ اور ہاں اس کا ایک تیسرا فائدہ بھی ہے۔ وہ.....وہ تو آپ کو پتا ہی ہوگا"۔

"چاچو دیکھا کتنا فائدہ مند کھیل ہے۔ آپ کو تو پتا ہونا چاہیے۔ آپ خود سمجھ دار ہیں" قاسم نے مکھن لگایا۔

"ہاں بھئی واقعی یہ تو بہت اہم کھیل ہے۔ میں تو بے خبر ہی رہا ہوں۔ پھر تو ہمیں ضرور پتنگ بازی کرنی چاہیے" چاچو نے بستر سے نکلتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور' مگر وہ.... آج چھٹی کی وجہ سے جیب خرچ نہیں ملا ناں' اسی لیے ہماری جیبیں خالی ہیں"۔

"اور مجھے اسی بات کا افسوس ہے کہ اگر ہم یہ عظیم کھیل نہ کھیل سکے تو پورا ہفتہ ہمیں دوبارہ موقع نہیں مل سکے گا۔ ہائے افسوس! پتھر کے زمانے کے لوگ پتنگ بازی کر گئے اور اکیسویں صدی کے لوگ یہ بھی نہ کر سکے"۔ عاصم نے افسردہ ہونے کی کامیاب اداکاری کی۔

"نہیں تمھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں' یہ لو تم 50 روپے لے جاؤ اور سارا ساز و سامان لے آؤ"۔ چاچو نے 50 کا نوٹ عاصم کی طرف بڑھا دیا اور وہ پیسے پکڑ کر فوراً باہر کی طرف لپکا۔ پھر پندرہ بیس منٹ کے بعد پتنگیں اور ڈوریں لے کر آ گیا۔

"یہ لیجیے چاچو' میں آپ کی خاطر سب کچھ لے کر آیا ہوں۔ مگر ایک مسئلہ ہے"۔

"اب کیا مسئلہ ہے؟"

"وہ دراصل آپ تو جانتے ہیں کہ ابو جان کتنے مصروف رہتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس کھیل کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا پتنگ اڑانے سے پہلے ان سے اجازت لینا پڑے گی اور اجازت صرف آپ ہی لے سکتے ہیں۔ کیوں کہ آپ ہمارے بڑے ہیں"۔

عاصم نے انہیں "بڑا" کہا تو وہ خوش ہو گئے۔ کیوں کہ انہیں بڑا بننے کا بہت شوق تھا۔

"نہیں بھئی' یہ تو بہت مشکل کام ہے"۔ چاچو نے صاف انکار کر دیا۔

"دیکھیں چاچو' اب تو سارا سامان بھی آ گیا ہے۔ دیر ہے تو صرف اجازت کی۔ اور اگر آج ہم پتنگ بازی سے محروم رہ گئے تو یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوگا"۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں کچھ کرتا ہوں۔ ویسے بھی بڑے ہی ایسی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں"۔

"بھائی جان' آج موسم کیسا ہے بھلا؟" چاچو چاند نے اپنے بڑے بھائی یعنی عاصم اور قاسم کے ابو عبدالکریم صاحب سے پوچھا۔

"آج تو بہت صاف موسم ہے' دھند بھی نہیں ہے" عبدالکریم صاحب نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک' اور آپ کو معلوم ہے پتنگ بازی ایسے صاف موسم میں ہی کی جا سکتی ہے"۔

"ارے چاند تمہیں پتنگ بازی کہاں سے یاد آگئی۔ تم نے تو کبھی پتنگ اڑائی ہی نہیں"۔

"وہ دراصل مجھے پتا ہی آج چلا ہے کہ یہ کتنا مفید کھیل ہے"۔

"مفید؟ وہ کیسے بھئی" عبدالکریم صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

"دیکھیں بھائی جان' اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ.... وہ .... پہلا فائدہ.... وہ.... وہ عاصم کو پتا ہے.... اور اس کا دوسرا فائدہ.... وہ.... وہ قاسم کو معلوم ہے.... اور تیسرا فائدہ.... اس کا تیسرا فائدہ بھی ہے۔ دیکھا بھائی جان' کس قدر فائدے ہیں اس کے۔ اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ آج پتنگ بازی کی جائے"۔

چاچو چاند نے بات ختم کی تو عبدالکریم صاحب چاچو کی بے وقوفی پر ہنسنے لگے اور بولے۔ "اچھا بھئی ٹھیک ہے' کر لو پتنگ بازی مگر احتیاط سے"۔ اب چاچو چاند فاتحانہ انداز میں اپنے کمرے میں واپس آئے جہاں قاسم اور عاصم بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر کچھ ہی دیر میں تینوں چھت پر تھے۔ عاصم اور قاسم تو ماہر تھے۔ وہ فوراً اپنی پتنگوں کو اونچی ہواؤں میں لے گئے جب کہ چاچو پتنگ اڑانے کے چکر میں ایک پتنگ ضائع کر چکے تھے اور اب دوسری کو اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اتنے میں قاسم کی نظر ایک کٹی ہوئی پتنگ پر پڑی جو ہوا میں اڑتی آرہی تھی۔ وہ چیخا" چاچو دوڑیں' پتنگ لوٹیں' بھاگیں"۔

چاچو فوراً نیچے کی طرف بھاگے۔ ان کا خیال تھا کہ پتنگ گلی میں گرے گی۔ اس لیے وہ گلی میں نکل آئے مگر پتنگ جھپ کھا کر ایک گھر میں جا گری۔ چاچو نے فوراً اس گھر کا دروازہ کھٹایا۔

اندر سے ایک بڑی بی باہر آئیں جنہیں دیکھ کر چاچو گھبرا گئے اور بولے۔ "جی.... وہ یہاں میری گڈی آئی ہے"۔

"گڈی؟ اے ہے شرم نہیں آتی' اتنا بڑا ہو گیا ہے اور ابھی تک گڈے گڈیوں سے کھیلتا ہے"۔

"جی میں کھیلنے والی گڈی کی نہیں اڑانے والی گڈی کی بات کر رہا ہوں"۔

"اچھا اچھا۔ ایک آئی تو ہے۔ ٹھہرو میں لا دیتی ہوں"۔ بڑی بی یہ کہ کر اندر گئیں اور پتنگ چاچو کو لا کر دے دی۔ چاچو خوشی خوشی واپس آرہے تھے کہ انہیں ایک روتے ہوئے بچے کی آواز سنائی دی۔

"یہی ہے ابو' یہی ہے میری پتنگ"۔

چاچو نے دیکھا تو کچھ فاصلے پر ایک بچہ اپنے ہٹے کٹے ابو کے ساتھ کھڑا چاچو کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ چاچو سمجھ گئے کہ خطرے کی گھنٹی بج گئی ہے۔ وہ فوراً واپس پلٹے مگر ایک وزنی ہاتھ نے پیچھے سے ان کی گردن دبوچ لی۔

"ابے لومڑ' کدھر جاتا ہے بچے کی پتنگ چھین کر!!! شرافت سے دے دے ورنہ ہڈی پسلی ایک کر دوں گا"۔

چاچو کو موت سامنے نظر آرہی تھی' فوراً بہانہ بنالیا اور عینک ٹھیک کرتے ہوئے بولے "اچھا اچھا تو یہ پتنگ آپ کے صاحب زادے کی ہے۔ میں تو کب سے پتنگ لیے گلیوں میں گھوم رہا ہوں کہ جس کی ہو اسے دے دوں"۔

بچہ پتنگ لے کر چلتا بنا اور چاچو دیکھتے رہ گئے۔ اب چاچو سوچ رہے تھے کہ خالی ہاتھ گھر کیسے جائیں۔ کیوں کہ ہار تو وہ کبھی مانتے نہیں تھے۔ اسی پریشانی کے عالم میں چاچو فضا میں نظریں دوڑانے لگے کہ کوئی اور پتنگ نظر آجائے تو وہ ہی لوٹ لیں۔ اتنے میں انہیں ایک بڑی سی پتنگ نظر آئی جو ایک درخت پر اٹکی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر چاچو نے پتنگ اتارنے کا تہیہ کر لیا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ درخت ایک کوٹھی میں تھا۔

"اب تو جو مرضی ہو جائے پتنگ اتار کر ہی رہوں گا"۔ چاچو چاند بڑبڑائے اور اس کوٹھی کی جانب چل دیے۔ کوٹھی کی دیواریں چھوٹی تھیں اور درخت بھی دیوار کے ساتھ ہی تھا۔ چاچو نے ادھر ادھر دیکھا اور جمپ لگا کر دیوار پر چڑھ گئے۔ پھر دیوار پر چلتے ہوئے درخت پر چڑھ گئے۔ خوش قسمتی سے انہیں کسی نے نہ دیکھا اور اس سے بڑی خوش قسمتی یہ کہ انہوں نے پتنگ بالکل سالم اتار لی۔ مگر کام اس وقت خراب ہوا جب چاچو نے درخت سے اتر کر ابھی دیوار پر پاؤں رکھے ہی تھے کہ یک دم کوٹھی کے اندر سے کتا بھونکا "بھوں بھوں"۔

کتے کی آواز سن کر چاچو جو لڑکھڑائے تو کوٹھی کے اندر گیلی کیاری میں آرہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پتنگ پھٹ کر کسی ہار کی طرح ان کے گلے میں پڑ گئی۔ پھولوں کی کیاری میں رات کا ٹھنڈا پانی ابھی تک کھڑا تھا جس کی ٹھنڈک سے چاچو کی تو گویا قلفی جم گئی۔ وہ کیچڑ سے نکل کر جو بھاگے تو کتا ان کے پیچھے لگ گیا اور ان کی پتلون کے ایک پائنچے کو دانتوں میں یوں کھینچا جیسے یہ اسی کا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاچو چاند ایک پائنچے سے محروم ہو گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک ٹانگ میں تو پتلون کا پائنچہ ہو اور دوسری ٹانگ میں لمبی نیکر پہن رکھی ہو۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کتے سے جان چھڑائی اور گھر کو بھاگے۔ بھاگتے ہوئے چاچو چاند کی حالت ملاحظہ ہو۔

"گلے میں پھٹی پتنگ' چہرے پر کیچڑ لگا ہوا' پتلون کا ایک پائنچہ گھٹنوں تک غائب' ایک پاؤں میں جوتا اور دوسرا پاؤں بغیر جوتے کے۔ کیوں کہ دوسرا جوتا کیاری میں رہ گیا تھا۔ ایسی حالت میں جو چاچو چاند گھر میں داخل ہوئے تو گھر والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ تو شکر ہے عاصم نے پہچان لیا۔ ورنہ گھر والے تو انہیں کسی اور سیارے کی مخلوق سمجھ بیٹھے تھے۔

"چاچو آپ تو پتنگ لینے گئے تھے"۔ قاسم نے حیرانی سے پوچھا۔

"مگر یہ تو خود ہی پھٹی پتنگ بنے ہوئے ہیں"۔ قاسم کی امی جان نے کہا تو سب زور زور سے ہنسنے لگے۔

سنی سنائی

زبیدہ سلطانہ

آخری تدبیر

فتح محمد ایک محنت کش کسان تھا۔ گاؤں میں اس کی تھوڑی سی زمین تھی۔ اسی کے ذریعے وہ گزر بسر کرتا تھا۔ بری بھلی زندگی گزر رہی تھی۔ خبر نہیں اس کی کیا شامت آئی کہ دوسری شادی کرلی۔ پہلی بیوی بڑی جھگڑالو تھی۔ ہر وقت فتح محمد کا ناک میں دم کیے رکھتی۔ شاید اسی کا انتقام لینے کے لیے اس نے دوسری شادی کرلی مگر یہ تو اور بھی جلتی پر تیل ڈالنے والی بات ہوگئی۔ اب تو بڑی بیوی جس کا نام جیناں تھا پل بھر کو زبان منہ میں نہ ڈالتی۔ ہر وقت لڑنے جھگڑنے رونے دھونے کی آواز سے نہ صرف فتح محمد اور اس کی چھوٹی بیوی رانی کا جینا محال ہوگیا بلکہ پڑوسیوں کا بھی امن حرام ہوگیا تھا۔

خیر جیسے کیسے وقت گزرتا گیا اور رانی بھی ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ جیناں کا بھی ایک بیٹا تھا۔

رانی بے چاری جیناں سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ گھر کا سارا کام کرتی۔ جیناں بس پلنگ پر بیٹھ کر حکم چلاتی۔ وہ ظالم عورت رانی اور اس کے بیٹے فیض کو بہت کم کھانا دیتی۔ رانی اپنے حصے کا کھانا بھی بیٹے کو کھلا دیتی اور خود اکثر بھوکی رہتی۔ آخر وہ محنت مشقت اور غذا کی کمی کے باعث بیمار رہنے لگی۔ جیناں بیماری میں بھی اسے آرام نہ کرنے دیتی اور بدستور کام لیا کرتی۔

ہوتے ہوتے رانی سوکھ کر کانٹا ہوگئی اور بستر سے لگ گئی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ بے چاری رانی کا آخری وقت آپہنچا۔ اس وقت اس کا بیٹا فیض پانچ چھ سال کا تھا۔ رانی کو اپنے بچے کا خیال چین سے مرنے بھی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد جیناں اس کے معصوم بچے کا برا حشر کردے گی۔ یہ فکر اس کے لیے موت سے بڑھ کر تھی۔ وہ ہر وقت یہی سوچتی رہتی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ فتح محمد بھی اس کے بچے کے لیے کچھ نہیں کرسکے گا۔ کیوں کہ وہ تو جیناں کے ہاتھوں خود بے بس تھا۔ بہت کم گھر میں آتا تھا۔ سارا وقت اب اپنے کھیتوں پر رہتا تھا۔

آخر سوچ سوچ کر رانی کو ایک تدبیر سوجھی۔ جیناں کی عادت تھی کہ وہ رانی کی ہر بات کا الٹ کرتی تھی اور اس کی ہر خواہش کو رد کر دیا کرتی۔ رانی نے ساری زندگی جیناں کی اس بری اور ضد کی عادت سے دکھ اٹھایا تھا مگر اس وقت وہی عادت رانی کو اپنے اس آخری مسئلہ کا حل نظر آئی۔

اس نے جیناں کو پاس بلایا اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بہن امیرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ خدا کے لیے میری یہ آخری بات مان لو کہ میرے بچے کو کھانے کے لیے مکھن اور باسی روٹی کبھی نہ دینا۔ نہ ہی کبھی اسے پڑھنے کے لیے مدرسے بھیجنا بلکہ اسے پراٹھے پر اچار رکھ کر دے دیا کرنا اور صبح سویرے بھینسوں کے ریوڑ کے ساتھ جنگل کو بھیج دیا کرنا۔ تاکہ میرا بچہ کھلی ہوا میں رہ کر اور اچار پراٹھا کھا کر صحت مند ہو جائے اور جلد بڑا ہو کر تمہاری اور اپنے بابا کی خدمت کرے"۔

جب رانی فوت ہو گئی تو اگلے ہی دن جیناں نے فیض کو گردن سے پکڑا اور اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ پھر باسی روٹی پر مکھن کا پیڑا رکھ کر اسے دیا اور کان سے پکڑ کر ملاجی کے پاس لے گئی۔

یوں وہ اسے وہاں پڑھنے بٹھا آئی۔ واپس آکر خوب گھی لگا کر پراٹھا پکایا اور اوپر اچار رکھ کر اپنے بیٹے رحمت کو کھلایا۔ ایک پراٹھا اور اچار دوپہر کو کھانے کے لیے جھاڑن میں لپیٹ کر اسے تھمایا اور خوب پیار کر کے اسے بھینسوں کے ریوڑ کے ساتھ جنگل کی طرف بھیج دیا۔

جیناں دل میں بہت خوش ہوئی تھی کہ وہ رانی کی روح کو تڑپا رہی ہے اور اس کی وصیت کے برعکس اس کے بیٹے کو پڑھنے کے لئے بٹھا آئی ہے اور اپنے بیٹے کو ڈھور ڈنگروں کے ساتھ باہر کی کھلی ہوا میں بھیجتی ہے۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ فیض مولوی صاحب کی صحبت میں رہ کر عالم فاضل بن گیا۔ سادہ غذا سے اس کا رنگ روپ نکھر آیا۔ وہ توانا اور صحت مند جوان نکل آیا۔

ادھر جیناں کا اپنا بیٹا جنگل میں چوپایوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتا خود اچار پراٹھا کھا کر اس پر خوب غنودگی طاری ہوتی۔ وہ دن بھر کسی گھنے درخت کے نیچے پڑا سویا رہتا۔ وہ دن بدن موٹا کند ذہن اور سست ہوتا چلا گیا۔ آخر اس کی سستی اور موٹاپے کا یہ حال ہوا کہ اس نے ڈھور ڈنگر لے کر جانے سے بھی انکار کر دیا۔ دن بھر گھر ہی میں پڑا رہتا۔ جب کہ فیض گاؤں کے مدرسے میں ماسٹر مقرر کر دیا گیا۔

اب جیناں کو اپنی ضد کی اچھی سزا ملی اور رانی نے مرتے مرتے اس سے خوب انتقام لیا!

تلاش گم شدہ

سلیم خان گمی

شیخ عرفان کے اکلوتے بیٹے محمد عمران کو اس کا نوکر فضل داد عرف فضلو ایک قریبی پارک میں سیر کروا رہا تھا کہ آئس کریم بیچنے والا گھنٹی بجاتا ہوا آیا اور بولا "آئس کریم لو ٹھنڈی میٹھی آئس کریم"

عمران جس کی عمر 6'7 برس تھی، فضلو سے کہنے لگا "آئس کریم والے سے میرے لیے آئس کریم خرید کر لاؤ"۔

فضلو آئس کریم والے کے پیچھے 10 روپے کا نوٹ لے کر بھاگا۔ آئس کریم لے کر واپس آیا دیکھا۔ عمران پارک میں موجود نہ تھا۔ فضلو نے اسے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔ دور ایک جیپ نظر آئی جو فوراً آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ فضلو سمجھ گیا کہ عمران کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ وہ روتا پیٹتا گھر کی طرف بھاگا کہ جا کر اطلاع کرے۔

فضلو کی بات سن کر عمران کی امی غش کھا کر گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔ شیخ عرفان نے قریبی ہسپتال فون کیا اور بیوی کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال بھجوایا۔ خود انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو اپنے بیٹے کے اغوا کی اطلاع دی۔ آئی جی اور ڈی آئی جی شیخ عرفان کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیخ حکومت کو سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرتا تھا جس کی رقم کروڑوں روپے تھی۔ اس کے کئی کارخانے تھے۔ وہ درآمدی اور برآمدی تجارت بھی کرتا تھا۔ یعنی دوسرے ملکوں سے تجارتی مال بھی منگواتا اور اپنے ملک میں تیار کیا ہوا مال دوسرے ملکوں کو بھیجتا۔ وہ غریب لوگوں اور معذوروں کی مالی مدد بھی کرتا تھا۔ ٹیلی فون کے فوراً بعد علاقے کے تھانے کا انچارج آیا اور پوچھ گچھ کے لیے فضلو کو پکڑ کر لے گیا۔ تھانے دار کے جانے کے بعد ایس پی سٹی آیا اور شیخ عرفان کو تسلی دیتے ہوئے بولا "سر آپ فکر نہ کریں، ملزم شام تک پکڑ لیا جائے گا"۔

شام تک ملزم تو نہ پکڑا گیا البتہ ملزم کا فون آیا۔

"میرا نام ورک ہے۔ میں لاہور میں رہتا ہوں۔ میں نے آج آپ کے بیٹے کو پارک سے اغوا کیا ہے۔ فضلو کا کوئی قصور نہیں"۔

"میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں۔ خدا کے لیے میرا بیٹا مجھے واپس کر دیں"۔

"میں آپ کے بیٹے کو چھوڑ دوں گا مگر پہلے مجھے پانچ کروڑ روپوں کی ادائیگی کیجیے"

"میں پانچ کروڑ ادا کر دوں گا۔ آپ میرا بیٹا مجھے واپس کر دیں"۔

"اگر اس وقت آپ کے پاس پانچ کروڑ ہیں تو لے کر آ جاؤ"

"اس وقت گھر میں پانچ لاکھ ہیں، پانچ کروڑ نہیں۔ ہاں

آپ چیک قبول کریں تو وہ حاضر ہے"۔

"نہیں ایسے کاموں میں چیک قبول نہیں کیا جاتا نقد صرف نقد کیش"

"وہ تو اس وقت نہیں لیکن میں وعدہ کرتا ہوں"

ورک نے شیخ کی بات کاٹی اور بولا "جرم کی دنیا میں وعدہ نہیں چلتا۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا معاملہ ہوتا ہے"۔

"آپ میری بات تو سن لیں۔ عمران کی ماں بے ہوش پڑی ہے۔ وہ عمران کے بغیر مر جائے گی۔ خدا کے لیے آپ عمران کو میرے حوالے کر دیں"۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں دوبارہ فون کروں گا" ورک نے کہا اور فون بند ہو گیا۔

شیخ عرفان نے گیراج سے کار نکالی اور سیدھا ایس ایس پی کے گھر گیا۔ اسے فون کے متعلق بتایا۔ ایس ایس پی نے ایس پی سٹی کو فون کیا اور حکم دیا کہ شیخ عرفان کے فون پر ریزرویشن لگا دیں یعنی جو فون آئے وہ ریکارڈ کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ حکم بھی دیا کہ دس پولیس پارٹیاں بنائی جائیں جن کا انچارج پولیس انسپکٹر ہو۔ وہ ملزموں کو جیپ سمیت تلاش کریں اور گرفتاری ڈالیں۔

شیخ عرفان کی تسلی کے لیے ایس ایس پی نے کہا "شیخ صاحب' عمران آپ کا بیٹا نہیں وہ میرا بیٹا ہے۔ اس کے اغوا کا مجھے بہت صدمہ ہوا ہے۔ آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کے کئی فون آ چکے ہیں۔ وہ بھی بہت پریشان ہیں۔ اسلام آباد سے وزیر داخلہ کا بھی فون آ چکا ہے۔ کیا وہ آپ کو جانتے ہیں؟"

"ہاں' وہ مجھے جانتے ہیں۔ ہم کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ایم اے کے بعد وہ سیاست کی طرف نکل گئے اور میں نے صنعت و تجارت کا شعبہ پسند کیا"

"وہ مقامی پولیس کے کام کی نگرانی کے لیے کسی اعلیٰ افسر کو لاہور بھیج رہے ہیں"

"ان کی مہربانی ہے لیکن اسلام آباد کے افسر کی ضرورت نہیں۔ ضرورت تو آپ کی توجہ کی ہے سر"۔

"ہم حاضر ہیں' ہر طرح"

شیخ عرفان نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ ایس ایس پی کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے شیخ صاحب؟" ایس ایس پی نے پوچھا۔

"یہ میری طرف سے تحریر ہے کہ اگر پولیس میرے بچے کو زندہ و سلامت برآمد کر کے مجھے لا دے تو میں پولیس ویلفیئر فنڈ میں پانچ کروڑ روپے چندہ دوں گا۔ جسے پولیس جس طرح چاہے خرچ کرے"۔

"سبحان اللہ' بڑی بات ہے"

"بات بڑی ہو یا نہ ہو رقم بڑی ہے"

"ہاں' رقم بہت بڑی ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ اغوا کرنے والوں نے پانچ کروڑ روپے طلب کیے ہیں"۔

"جی ہاں' ورک نے کہا تھا کہ

پانچ کروڑ روپے دو اور اپنا بیٹا لے لو۔ میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ وہ نقد مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا چیک لے لو۔ وہ نہ مانا"۔

ایس ایس پی نے شیخ عرفان کی بات سن کر ایس پی کو فون کیا اور کہا "شیخ عرفان نے مجھے لکھ کر دیا ہے کہ اگر اس کا بیٹا برآمد کر کے اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ پولیس ویلفیئر فنڈ میں پانچ کروڑ روپے کی رقم بطور عطیہ دیں گے۔ آپ اس امر کی اطلاع تمام متعلقہ تھانوں میں کروا دیں تاکہ افسر اہل کار اور ملازم زیادہ لگن اور محنت سے شیخ صاحب کے صاحب زادے کو تلاش کریں"۔

"میرے خیال میں یہ اطلاع صرف پولیس تک محدود رہنی چاہیے۔ اگر عام لوگوں کو پتا چل گیا تو ملزموں کو بھی پتا چل جائے گا" شیخ عرفان نے کہا۔

"آپ کا خیال درست ہے۔ یہ اطلاع پولیس تک ہی رہے گی" ایس ایس پی بولا

"میرا خیال ہے ملزم یا ملزمان ابھی تک لاہور میں ہیں"۔

"آپ درست سمجھے۔ وہ لاہور سے باہر نہیں گئے۔ نہ جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ لاہور سے باہر جانے والے ہر راستے کی ناکہ بندی ہو چکی ہے" ایس ایس پی نے کہا۔

"ورک آج رات مجھے فون کرے گا اور بتائے گا کہ میں رقم لے کر کل کہاں پہنچوں؟" شیخ عرفان بولا۔

"اس کے فون کے بعد مجھے فوراً اطلاع کریں۔ میں اس وقت گشت پر جا رہا ہوں۔ آپ گھر جائیں۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس گھر آجاؤں گا۔ آپ مجھے گھر پر فون کریں"۔

جب شیخ عرفان گھر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بیوی ابھی تک بے ہوش ہے۔ ڈاکٹروں کا بورڈ بن گیا ہے اور وہ اسے ہوش میں لانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ رات کے 10 بجے ورک کا فون آیا۔

"شیخ صاحب' آپ ورک سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کا بیٹا خوش و خرم ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ کل پانچ کروڑ روپے کا انتظام کریں اور رات 11 بجے رقم لے کر شملہ پہاڑی کے اوپر آجائیں۔ وہاں ایک چھتنارا درخت ہے۔ اس کے نیچے سیمنٹ کا چبوترا ہے۔ چبوترے پر سیمنٹ ہی کی دو کرسیاں ہیں۔ میں اور عمران آپ کو ان کرسیوں پر بیٹھے ملیں گے۔ نوٹ بریف کیس میں ہوں۔ پولیس کو ہرگز اطلاع نہیں ہونی چاہیے۔ اگر پولیس کو اطلاع ہوئی تو آپ کو آپ کا بیٹا نہیں ملے گا۔ ہاں اس کی لاش ملے گی"۔

شیخ عرفان نے ایس ایس پی کو فون کیا۔ وہ شیخ ہی کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ شیخ عرفان کی بات سن کر ایس ایس پی نے سوال کیا۔

"آواز کیسی تھی؟ میرا مطلب ہے مہذب تھی یا کھردری؟"

"آواز قدرے کھردری تھی' دیہاتی قسم کی"

"اگر یہ بات ہے تو وہ واردات کے لیے پنجاب کے کسی دوسرے ضلع سے لاہور آیا ہے۔ ورک پنجاب میں ہی ہوتے ہیں کسی دوسرے صوبے میں نہیں ہوتے۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں"۔

"آپ کی دل چسپی کی وجہ سے میری پریشانی کم ہو گئی ہے سر' آپ جیتے رہیں"

"ہمیں آج کی رات اور کل کا سالم دن مل گیا ہے' ورک اور اس کے ساتھیوں کو پکڑنے کے لیے"۔

"آواز نوجوان کی تھی یا جوان کی یا ادھیڑ عمر شخص کی؟"

"آواز سے پتا چلتا تھا کہ بولنے والا بیس اور تیس سال کے درمیان ہے"۔

"میں ریکارڈنگ منگوا کر آواز سنتا ہوں۔ اس کے بعد ہی مجرم کی شخصیت کا تجزیہ کر سکوں گا"۔

ورک نے شیخ عرفان سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ کئی دن سے اس کے بیٹے عمران کو پارک میں کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ فضلو کو بھی عمران کے ساتھ دیکھتا تھا۔ واردات کے دن اس نے موقع غنیمت جانا۔ فضلو آئس کریم لینے آئس کریم والے کے پیچھے لپکا تو اس نے عمران کو اٹھایا۔ ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور جیپ میں ڈال کر بند روڈ کے ایک تہ خانے میں لے گیا۔ یہاں

عمران کو رکھنے کے لیے پہلے سے ایک کمرا تیار کیا گیا تھا۔ تہ خانے کے باہر پٹھان چوکی دار تھا۔ جس کمرے میں عمران کو رکھا گیا اس کا انچارج کریم بخش تھا۔ اس کی عمر 40 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ کسی زمانے میں ریڈیو اسٹیشن پر ڈھولک بجاتا تھا۔ پھر چرس پینے کے جرم میں اور لگاتار غیر حاضر رہنے پر اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ وہ اب ورک کا ذاتی ملازم تھا۔

عمران کو تہ خانے میں لا کر کریم بخش نے ورک کی ہدایت کے مطابق پھل وغیرہ لا کر دیئے اور اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن عمران مسلسل آئس کریم کا تقاضا کرتا رہا۔ جب تک ورک تہ خانے میں رہا کریم بخش نے عمران کی بات نہ مانی لیکن جب وہ ڈرائیور کے ساتھ چلا گیا تو کریم بخش آئس کریم لانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے پاس ورک کے دیئے ہوئے سو روپے تھے۔ جب کریم بخش چلنے لگا تو عمران بھی ساتھ چل پڑا۔ کریم بخش نشے میں تھا۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ عمران کو لے کر باہر نہیں جانا چاہیے۔ جب وہ دونوں پٹھان چوکی دار کے پاس سے گزرے تو اس نے کہا "کدھر جاتی ہے؟"

کریم بخش نے کہا "خان' اس بچونگڑے کے لیے آئس کریم لینے جا رہا ہوں۔ ابھی گیا ابھی آیا"۔

یہ سن کر چوکی دار خاموش ہو گیا۔ حال آں کہ اسے حکم تھا کہ عمران اور کریم بخش تہ خانے سے باہر نہ آئیں۔

وہ تہ خانے سے نکل کر بند روڈ پر آئے۔ یہاں پر دھول کے بادل اڑ رہے تھے۔ ان بادلوں کی دوسری طرف سانده خورد اور سانده کلاں کی بستیاں ہیں۔ کریم بخش گرد وغبار میں گم ہو گیا۔ عمران نے سامنے دیکھا۔ گرد وغبار میں ایک بس آ کر رکی۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھائے اور اس میں سوار ہو گیا۔ بس چلتی رہی اور رکتی رہی اور آخر کار راوی کے پرانے پل کے اڈے پر جا کر رکی۔

بس میں سے ساری سواریاں اتر گئیں تو عمران بھی اتر گیا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے دریائے راوی بہ رہا ہے۔ دریا پر پرانا پل ہے جس پر سے تانگے اور ریڑھے آ جا رہے ہیں۔ اڈے کے ساتھ ریسٹ ہاؤس اور مسجد کی عمارتیں ہیں۔ قریب ہی ایک قبر ہے جس کے ارد گرد سبز جھنڈیاں لہرا رہی ہیں۔

سڑک کے ساتھ ایک سوکھا ہوا تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے دس بارہ آوارہ بچے کھڑے تھے اور عمران کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بچے پھر چلتے چلتے اس کی طرف بڑھے اور اس کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ ان کا لیڈر بھوندو تھا۔ جس کی عمر 11 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ کل گیارہ تھے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بھوندو

نے عمران سے پوچھا۔ عمران نے کوئی جواب نہ دیا' چپ رہا۔
"میں نے تجھ سے پوچھا ہے کیا نام ہے تمہارا؟" بھوندو نے کھردرے انداز میں پوچھا۔ اس کا قد لمبا تھا۔ ناک چپٹی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں جیسے قمیص کے بٹن ہوں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے اور خشک تھے۔ ان میں تنکے پھنسے ہوئے تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ زمین پر سویا ہے۔ ناخن لمبے اور میلے تھے۔ ہاتھوں کی کھال سوکھ رہی تھی۔ بھوندو کے علاوہ دوسرے بچوں کی حالت بھی چنداں ٹھیک نہ تھی۔ ان بچوں میں ایک لڑکی ریشم تھی۔

"میں بتاتی ہوں اس کا نام ہے غوچا" ریشم نے کہا۔

"کیا مطلب ہے اس کا؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم غوچا اس کو کہتے ہیں جو واقف نہ ہو۔ اجنبی ہو۔ جسے ہم نہ جانتے ہوں" ریشم نے کہا جو شکل سے افغانی لگتی تھی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"میرا نام ہے ریشم اور اس بھائی کا نام ہے بھوندو" ریشم بولی۔

"بھوندو کا کیا مطلب ہوا؟" عمران نے سوال کیا۔

"بھوندو کا مطلب ہے گھومنے والا' یہ گھومتا بہت ہے" ریشم نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے تو بھوک لگی ہے" بھوندو نے کہا۔

"بھوک تو ہم سب کو لگی ہے۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ صرف مسجد کے کنوئیں سے پانی پیا ہے" ریشم بولی۔

"میرے پاس پیسے ہیں۔ چلو چل کر کھانا کھاتے ہیں" عمران نے کہا تو ان سب کی آنکھوں میں روشنی آگئی۔ وہ سب عمران کا فقرہ سن کر خوش ہوگئے تھے۔

"آؤ پھر چلیں۔ وہ سامنے کھوکھا ہے۔ کھوکھے کے ساتھ تنور ہے۔ اس نے دال اور شلجم کا سالن بھی تیار کیا ہوگا" بھوندو بولا اور چل پڑا۔

"وہ چاول بھی پکاتا ہے۔ میں چاول اور شلجم کھاؤں گی" ریشم بولی۔

بارہ بچوں کا یہ گروپ تنور والے کے پاس پہنچا اور خالی بنچوں پر بیٹھ گیا۔ بھوندو نے کھانے کا آرڈر دیا۔ لڑکوں نے روٹیاں جب کہ لڑکیوں اور عمران نے چاول پسند کیے۔ کھانا کھانے کے بعد عمران نے اپنی نیکر کی خفیہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور 500 روپے کا نوٹ نکال کر بھوندو کو دیا۔ بھلا تنور والے کے پاس 500 کی ریزگاری کہاں؟ اس نے اپنے ایک ساتھی کو نوٹ دیا اور کھوکھے والے کے پاس بھیجا جو سو سو روپے کے پانچ نوٹ لایا۔ تنور کے مالک نے 120 روپے کاٹے اور 380

روپے بھوندو کو واپس کیے۔ بھوندو نے وہ رقم عمران کو دی جس نے اسے پھر خفیہ جیب میں احتیاط سے رکھ لیا۔

پھر بھوندو ایک طرف چل پڑا۔ باقی سب اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ ابھی ویگنوں کے اڈے پر نہ پہنچے تھے کہ پولیس کی ایک جیپ بھوندو کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ جیپ میں سے دو سپاہی نیچے اترے۔ ایک سپاہی نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے چھوٹے تھانے دار سے پوچھا "ان بچوں کا کیا کیا جائے؟"

"ان کو جیپ میں بٹھاؤ اور تھانے لے چلو۔ آج تھانے میں ایس پی صاحب آ رہے ہیں' معاینہ کے لیے۔ وہ جانیں اور یہ بچے جانیں"۔

سپاہیوں نے ان سب کو جیپ میں بٹھایا اور تھانے لے گئے۔ تھانے میں ان کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ ان کو بتایا گیا کہ بڑا صاحب ان کا معاینہ کرے گا۔ کافی دیر انتظار کے بعد ایس پی سٹی چھڑی گھماتا ہوا آیا اور بچوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ "صاف ظاہر ہے کہ یہ آوارہ بچے ہیں جو سڑکوں اور چوراہوں پر کھڑے ہو کر بھیک مانگتے ہیں' جیبیں کترتے ہیں"۔ یہ کہتا ہوا ایس پی عمران کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"یہ بچہ کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہم پرانے راوی پل کے پاس رہتے ہیں۔ بھیک مانگتے ہیں۔ مزدوری مل جائے تو مزدوری کر لیتے ہیں" بھوندو بولا۔

"میں نے پوچھا ہے یہ بچہ کون ہے؟" ایس پی نے پھر کہا۔

"سر! ہم بارہ ہیں۔ ان میں اوڈ بچے' چنگڑ بچے' مصلی بچے اور افغانی بچے بھی ہیں" بھوندو بولا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے لیکن یہ بچہ کون ہے؟ کیا نام ہے اس کا؟" ایس پی نے ذرا تلخی سے کہا۔

"اس کا نام ہے غوچا۔ یہ بھی ہمارے ساتھ ہے" بھوندو بولا۔

ہندو روڈ کی دھول سے عمران کا گورا چہرہ میلا ہو گیا تھا۔ اس کے بالوں میں خاک پڑی ہوئی تھی۔ دھاری دار قمیص میلی ہو چکی تھی۔ جوگروں پر بھی گرد کی تقریباً ایک ایک انچ موٹی تہ جمع ہو گئی تھی۔ اب وہ بھی آوارہ بچوں میں سے ایک دکھائی دے رہا تھا۔

"ان کو جہاں سے لائے ہو وہیں چھوڑ آؤ۔ جیپ میں بٹھا کر" ایس پی نے کہا اور پلٹ گیا۔

تھانے کا ڈرائیور بچوں کو جیپ میں بٹھا کر راوی روڈ پر لے گیا اور وہ سب اتر کر ایک آئس کریم بیچنے والے کے پاس گئے اور دس دس روپوں والی ایک ایک آئس کریم کھائی۔ اب کے بھی خرچ ایک سو بیس روپے ہوئے تھے۔

رات کو جس وقت ورک شیخ عرفان سے فون پر عمران کے بارے بات کر رہا تھا' اسے پتا تھا کہ عمران بھاگ گیا ہے۔ اس نے کریم بخش کو ہلاک کر دیا تھا اور لاش تہ خانے کے اندر دفن کر دی تھی۔ اب وہ اور اس کے ساتھی جیپ میں بیٹھ کر عمران کو سانده کلاں' اسلام پورہ' بیشنل ٹاؤن' سنت نگر اور گلشن راوی کے علاقوں میں تلاش کر رہے تھے۔ جب کہ لاہور کی پولیس بھی سارے شہر میں گھوم رہی تھی اور ملزموں کو تلاش بھی کر رہی تھی۔

غوچا اور اس کے 11 ساتھیوں نے شام ایک دربار پر گزاری۔ سب نے وہاں مفت تقسیم ہونے والا زردہ اور پلاؤ کھایا۔ بھوندو نے ایک جیب کاٹی جس میں سے شناختی کارڈ' 50 روپے کا نوٹ اور نارووال سے لاہور تک بس کا ٹکٹ ملے۔ غوچا پارٹی نے رات پرانے راوی پل کے پاس دریا کے کنارے پر موجود مسجد میں گزاری۔ جس وقت ورک شیخ عرفان سے فون پر گفت گو کر رہا تھا' عمران یہاں فرش پر سویا ہوا تھا۔

دوسرے دن ورک نے فون کر کے اس بات کا یقین کیا کہ وہ رات 10 بجے سے 11 بجے تک شملہ پہاڑی پر موجود ہو گا اور عمران اس کے ساتھ ہو گا۔ شیخ عرفان نے یہ بات ایس ایس پی کو بتائی اور انہوں نے ملزم کو گرفتار کرنے کے لیے انتظامات کو آخری شکل دی۔

رات 10 بجے شیخ عرفان سوٹ کیس میں 5 کروڑ روپے کے جعلی نوٹ لے کر شملہ پہاڑی پہنچا۔ اس نے پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھا کہ دو شخص سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھے ہوئے

ہیں۔ ایک ورک اور دوسرا اس کا بیٹا۔ لیکن اس کے بیٹے نے سر پر سفید چادر لے رکھی تھی۔ وہ اوپر چڑھ رہا تھا کہ ورک بھاگ کر آیا۔ اس نے سوٹ کیس لیا اور بولا۔

"یہاں ٹھہرو' میں عمران کو لاتا ہوں"

شیخ ابھی سنبھلا نہ تھا کہ پولیس نے فائرنگ شروع کر دی۔ ورک پنج کے قریب گرا۔ سفید چادر اوڑھے جو شخص بیٹھا تھا اسے دیکھا گیا تو وہ مرا پڑا تھا۔ وہ ورک کا ہی ایک ساتھی تھا۔ عمران کا کچھ پتا نہ تھا۔ شیخ عرفان 5 کروڑ کے جعلی نوٹ لے کر گھر گیا اور پولیس نے دونوں لاشیں اپنے قبضے میں لے لیں۔ اگلے دن لاہور کے اخباروں میں پولیس مقابلے کی خبر چھپ گئی جو گوچا اینڈ پارٹی کے کسی رکن کی نظر سے نہ گزری۔ وہ شام تک فروٹ مارکیٹ میں گھومتے رہے اور گلے سڑے پھل کھاتے رہے۔ صرف ایک عمران تھا جس نے خرید کر اچھا پھل کھایا۔

سب شام کو ویگن میں بیٹھ کر لاہور شہر کے ایک مشہور علاقے اچھرہ میں آگئے۔ یہاں چوک سے تھوڑا ہٹ کر کوئی شخص زردہ اور پلاؤ مفت تقسیم کر رہا تھا۔ بھوندو نے گوچا کی ٹریننگ کے لیے اسے کہا "زردہ کی دیگ کے پاس بھیڑ میں کھڑے شخص کی جیب میں ہاتھ ڈالو اور پھر نکال لو۔ جیب سے کچھ نکالنے کی ضرورت نہیں"۔

وہ جیب کترا نہیں تھا۔ اس کی صرف ٹریننگ ہو رہی تھی۔ چناں چہ عمران نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جس شخص کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اس نے منہ موڑ کر جلدی سے عمران کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عمران نے اس شخص کی طرف دیکھا اور چلایا "پاپا' میرے پاپا"

"عمران' میرا بیٹا' اخدایا تیرا شکر ہے"

شیخ عرفان یہاں زردے پلاؤ کی دیگیں لے کر غربا اور مساکین میں تقسیم کرنے آیا تھا کہ ان کی دعاؤں سے اسے اس کا بیٹا مل جائے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

پھر شیخ عرفان نے 5 کروڑ روپے خرچ کر کے ٹرسٹ بلڈنگ بنوائی اور اس میں یتیم اور بے سہارا بچوں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام کیا۔ سب سے پہلے جو بچے وہاں آئے وہ گوچا پارٹی کے تھے۔ عمران نے ریشم کو اپنی بہن بنا لیا اور وہ ان کے گھر' شیخ عرفان کی بیٹی بن کر رہنے لگی۔ اب شیخ عرفان اکثر کہتا "اللہ تعالیٰ نے شاید اس نیک کام کی توفیق دینے کے لیے ہی مجھے اس آزمائش میں ڈالا تھا"۔

حسن ذکی کاظمی

پُراسرار ڈاکٹر

پروفیسر دانش کی سکریٹری نے انہیں اطلاع دی کہ ڈاکٹر ذہین ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ پروفیسر اپنا کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور ڈاکٹر ذہین کو خوش آمدید کہنے خود سکریٹری کے کمرے کی طرف لپکے۔ ڈاکٹر ذہین نے انہیں آتے ہوئے دیکھا تو ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور اشاروں میں بولے:

"میں خود آجاتا' آپ نے کیوں تکلیف کی"

پروفیسر دانش نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا

"ڈاکٹر ذہین' آپ ایک عظیم ہستی ہیں۔ واقعی نہایت ذہین' میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے"

ڈاکٹر ذہین کی باچھیں کھل گئیں اور موٹے موٹے چوڑے چوڑے ہونٹوں سے ان کے بڑے بڑے چمکیلے دانت باہر نکل آئے۔ انہوں نے شکریہ ادا کرنے کے لئے سر سے اپنا ہیٹ اتار اور سر جھکا دیا۔ پھر ہاتھ سے دایاں گال کھجاتے ہوئے بولے:

"پروفیسر! آپ میرے محسن ہیں"۔

"پروفیسر دانش ڈاکٹر ذہین کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آئے اور انہیں صوفے پر بٹھا کر خود بھی ان کے قریب بیٹھ گئے۔ دونوں میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ پروفیسر نے کہا:

"دراصل آپ کو میں نے یہاں آنے کی تکلیف اس لئے دی ہے کہ آج ہی مجھے عالمی ادارہ صحت کا ایک پیغام ملا ہے۔ یہ ادارہ آپ کو ایک اعزاز دینا چاہتا ہے جس کے ساتھ کافی بڑی نقد رقم بھی دی جائے گی"۔

پروفیسر کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر ذہین چونک کر بولے۔

"مجھے! اوہ کس لئے؟"

"اس لئے کہ آپ نے انسانی صحت کے لئے بہت قیمتی تحقیق کی ہے اور کر رہے ہیں" پروفیسر دانش نے جواب دیا۔

ڈاکٹر ذہین نے پھر بڑے بڑے چمکیلے دانت چوڑے ہونٹوں سے نکالے اور ہاتھ کے اشارے سے کہا:

"میں کچھ بھی نہیں آپ میرے محسن ہیں"۔

پروفیسر دانش نے ڈاکٹر ذہین کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میں ادارہ صحت کو اطلاع دے دیتا ہوں کہ آپ یہ اعزاز قبول کرنے کو تیار ہیں"۔

ڈاکٹر ذہین سر ہلاتے ہوئے بولے "شکریہ۔۔۔ مگر وہ ڈاکٹر ماہر۔۔۔۔"

ڈاکٹر ذہین نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو پروفیسر دانش نے کہا "بھئی یہ اعزاز ہم تو نہیں دے رہے' عالمی ادارہ صحت دے رہا ہے۔ اس نے جسے مناسب سمجھا اسے دے دیا۔ اگر ڈاکٹر ماہر کو شکایت ہو تو اس ادارے سے کریں"۔

پروفیسر دانش اپنے ملک کے سائنس بورڈ کے صدر تھے اور ڈاکٹر ذہین اور ڈاکٹر ماہر اس ادارے کے رکن تھے۔ یہ دونوں سائنس دان پروفیسر دانش سے بہت قریب تھے لیکن وہ ان دونوں میں سے ڈاکٹر ذہین کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ڈاکٹر ذہین کو عظیم سائنس دان بنانے میں پروفیسر دانش کا ہی ہاتھ تھا اور دوسری وجہ یہ کہ ڈاکٹر ذہین بہت محنتی اور فرض شناس تھے۔ وہ نہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے تھے اور نہ کسی سے حسد کرتے تھے۔ جب کہ ڈاکٹر ماہر ڈاکٹر ذہین کی کامیابی اور شہرت سے بہت جلتے تھے۔ وہ اپنی اس جلن کو چھپا بھی نہ پاتے تھے اور اکثر ڈاکٹر ذہین کو جلی کٹی سناتے رہتے تھے۔

جیسے ہی ڈاکٹر ماہر کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذہین کو اعزاز ملنے والا ہے تو انہوں نے بورڈ کے اجلاس میں پروفیسر دانش سے سوال کیا۔ "پروفیسر! ہم نے سنا ہے کہ اب ہر ایرے غیرے کو عالمی اعزاز ملنے لگا ہے؟"

پروفیسر دانش کو ڈاکٹر ماہر کی یہ بات بہت بری لگی اور وہ ڈاکٹر ماہر کو سخت جواب دینے والے تھے کہ ڈاکٹر ذہین نے مسکراتے ہوئے اپنے خاص انداز میں کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ابھی تک ایروں غیروں میں بھی شامل نہیں کیا گیا"۔

سب لوگ ہنسنے لگے اور ڈاکٹر ماہر شرمندہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد پروفیسر دانش نے ڈاکٹر ماہر سے پوچھا۔

"ڈاکٹر ماہر! پچھلے اجلاس میں میں نے آپ سے کہا تھا کہ بوڑھے لوگوں میں بھول جانے کی عادت یا نسیان کے بارے میں ایک نیا مضمون تیار کر دیں جو سائنس میگزین کو بھیجنا ہے۔ آپ نے کچھ تیاری کر لی؟"

ڈاکٹر ماہر نے چونک کر جواب دیا "اوہ! پروفیسر صاحب' میں سخت شرمندہ ہوں۔ میں بالکل بھول گیا"

ڈاکٹر ذہین خوب مسکرائے اور اب انہوں نے جوابی حملہ کیا "پروفیسر دانش! میرا خیال ہے میرا دوست ماہر خود نسیان کا مریض ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس سے نسیان پر کچھ لکھوانا...."

ڈاکٹر ذہین کے لئے جملہ پورا کرنا مشکل ہو رہا تھا لہٰذا کسی اور ساتھی نے اسے اس طرح پورا کیا:

"....نہایت خطرناک اور شرمندگی کا باعث ہو گا"۔

اب جو قہقہہ لگا تو ڈاکٹر ماہر بالکل کھسیانے ہو گئے۔

"ڈاکٹر ماہر کو ڈاکٹر ذہین کے اعزاز کی اتنی جلن نہیں تھی جتنی یہ فکر تھی کہ اعزاز کے ساتھ جو بڑی رقم ملے گی وہ کس کام آئے گی۔ وہ اکثر پروفیسر دانش کو یہ بات سمجھاتے رہتے تھے کہ ڈاکٹر ذہین کی نہ کوئی خاص ضروریات ہیں اور نہ ان کے آگے پیچھے کوئی ہے۔ پھر بھلا وہ اس رقم کا کیا کریں گے؟

ڈاکٹر ماہر کے اس سوال کے جواب میں پروفیسر دانش یہی کہتے تھے کہ یہ ڈاکٹر ذہین کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ چاہیں تو اس رقم کو دریا میں پھینک دیں۔ ڈاکٹر ماہر پروفیسر دانش کے اس جواب سے حوصلہ نہ ہارے اور اب انہوں نے ایک نئی بات پیدا کی۔ انہوں نے پروفیسر سے کہا۔

"پروفیسر صاحب' دراصل سارا کمال تو آپ کا ہے۔ آپ نے ہی اسے ایک معمولی حیثیت سے اٹھا کر ڈاکٹر ذہین بنا دیا۔ اتنی پستی سے اتنی بلندی پر پہنچانا...."

پروفیسر دانش نے ڈاکٹر ماہر کی بات کاٹی۔

"میں نے جو کچھ کیا اس کا صلہ مجھے مل چکا ہے۔ میں نے سائنس کی جو خدمت کی ہے اسے ساری دنیا نے مانا ہے۔ بس میرے لئے اتنا کافی ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے"۔

پروفیسر دانش کی اس بات کے باوجود ڈاکٹر ماہر ڈھیٹ بنے رہے اور بولے "وہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کو بے شمار اعزاز مل چکے ہیں لیکن ذہین کی اتنی ہمت نہ بڑھایئے کہ وہ آپ سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرے"۔

ڈاکٹر ماہر کی اس بات کا بھی پروفیسر دانش پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ منہ لٹکائے واپس آ گئے۔

پروفیسر دانش کے ذریعے ڈاکٹر ذہین کو اطلاع دی گئی کہ

7نومبر 2028ء کو انہی کے شہر میں ایک تقریب ہو گی جس میں مختلف ملکوں کے سائنس دان شریک ہوں گے اور عالمی ادارہ صحت کا نمائندہ انہیں اعزاز اور چیک پیش کرے گا۔

پروفیسر دانش کے ملک میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں بڑا جوش و خروش تھا۔ 7نومبر ابھی دور تھی لیکن لوگ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے اور بہت زور شور سے اس تقریب کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ادارہ صحت کی طرف سے یہ اپنی طرح کا پہلا انعام تھا۔ وقت گزرتا رہا اور آخر 7نومبر کی تاریخ آن پہنچی۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب سے آگے دنیا کے مشہور سائنس دانوں کی نشستیں تھیں۔ ایک طرف اخباری نمائندوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اسٹیج پر عالمی ادارہ صحت کے نمائندے کے ساتھ پروفیسر دانش اور سائنس بورڈ کے دوسرے ممبر بیٹھے تھے۔ لیکن سب نے یہ بات محسوس کی کہ ڈاکٹر ذہین اسٹیج پر نہیں تھے اور نہ وہ ہال میں کہیں اور نظر آ رہے تھے۔

ڈاکٹر ذہین وقت کے بہت پابند تھے اور یہ موقع بھی بہت اہم تھا لہٰذا ہر ایک کو سخت تعجب تھا کہ ڈاکٹر ذہین نے آنے میں دیر کیوں کی۔ پروفیسر دانش ایک طرف تو ڈاکٹر ذہین کی طرف سے پریشان تھے اور دوسری طرف انہیں عالمی ادارہ صحت کے نمائندے سے شرمندگی تھی کہ انہیں انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ پروفیسر دانش کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ڈاکٹر ماہر نے کچھ گڑبڑ کی ہے لیکن نہ تو ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت تھا اور نہ ہی یہ موقع ایسا تھا کہ وہ اپنا شبہ ظاہر کرتے۔

کافی انتظار کے بعد ادارہ صحت کے نمائندے نے پروفیسر دانش سے کہا "پروفیسر! میرا خیال ہے کہ اب اور انتظار کرنا بے کار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ذہین کے ساتھ کوئی حادثہ یا ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ وہ مجبور ہو گئے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ یہ تقریب ملتوی کر دیں اور ڈاکٹر ذہین کی تلاش پر پوری توجہ دیں"۔

پروفیسر دانش نے بڑی کمزور آواز میں جواب دیا۔ "میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ ساتھ ہی مجھے ڈاکٹر ذہین کے بارے میں بے حد فکر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا"۔

ادارہ صحت کے نمائندے نے ڈاکٹر ذہین کا اعزازی تمغہ اور انعامی رقم کا چیک پروفیسر دانش کے حوالے کیے اور یہ تقریب اس دعا پر ختم ہو گئی کہ ڈاکٹر ذہین خیریت سے ہوں اور جلد ان کا پتا چل جائے۔

ایک طرف مہمانوں کی واپسی شروع ہوئی اور دوسری طرف ڈاکٹر ذہین کی تلاش۔ ہر شخص فکر مند تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ماہر بھی بار بار اپنی پریشانی ظاہر کر رہے تھے۔ پروفیسر کو اندازہ تھا کہ یہ سب ڈاکٹر ماہر کا کیا دھرا ہے اور وہ محض ڈراما کر رہے ہیں۔ پولیس اور خفیہ اداروں نے ڈاکٹر ذہین کی تلاش کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا اور شہر کا کونا کونا چھان مارا لیکن ان کا کہیں پتا نہ چلا اور نہ ہی کسی کے خلاف کوئی ثبوت ملا۔

جتنا وقت گزر رہا تھا ڈاکٹر ماہر پر پروفیسر دانش کا شبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جلد ہی کوئی ایسا ثبوت مل جائے گا جس کے سبب ڈاکٹر ماہر پکڑے جائیں گے۔

ڈاکٹر ذہین کیا غائب ہوئے اخباری نمائندے پروفیسر دانش کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ ہر وقت اور ہر جگہ پروفیسر دانش ان

کے نرغے میں رہتے۔ ٹیلی فون پر بھی وہ ان کا پیچھا نہ چھوڑتے۔
دسیوں سوال تھے۔ ڈاکٹر ذہین کہاں گئے؟ وہ خود بھاگ گئے یا انہیں کسی نے اغوا کیا؟ کیا وہ زندہ ہیں؟ وہ کب واپس آئیں گے؟ کیا جو تحقیق وہ کر رہے تھے وہ مکمل ہو چکی ہے؟ انہیں تلاش کرنے کے لیے کیا کوشش کی جا رہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

پروفیسر دانش کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا جواب دیں۔ چند دن بعد جزیرہ کے سب سے بڑے اخبار میں ڈاکٹر ذہین کی تصویروں کے ساتھ ایک فیچر شائع ہوا جس کا عنوان تھا "ذہین بن مانس واپس چلا گیا"۔

ڈاکٹر ذہین کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ وہ انسان نہیں بلکہ بن مانس تھے۔ 20ویں صدی کے آخری برسوں میں جو تحقیق ہوئی اس سے پتا چلا کہ انسان اور بن مانس کے دماغی جین یا مورثوں میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ بمشکل ہزار مورثے ایسے ہوں گے جو انسان اور بن مانس میں مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بن مانس کی حرکات انسان سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ سائنس دانوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اگر مورثاتی انجینئری کے ذریعے بن مانس کے دماغی خلیوں میں رد و بدل کر کے انسانی دماغی خلئے اس کے دماغ میں داخل کر دیئے جائیں تو اس کی ذہانت میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔

21ویں صدی شروع ہونے کے بعد پروفیسر دانش نے ان سائنس دانوں کے خیال کو حقیقت میں بدل دیا۔ 15 سال کی تحقیق کے بعد وہ انسانی خلیوں کی بن مانس کے دماغ میں پیوندکاری کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس تجربے نے ایک عام بن مانس کو ڈاکٹر ذہین بنا دیا تھا۔

اخباری فیچر میں ڈاکٹر ذہین کی پوری کہانی کے بعد یہ تفصیل بھی بتائی گئی تھی کہ انسانی خلیوں کی پیوندکاری کے بعد انہوں نے ترقی کا لمبا سفر صرف سات آٹھ سال کے عرصے میں طے کر لیا۔ انہوں نے نہ صرف انسانوں کی طرح بولنا اور لکھنا پڑھنا سیکھا بلکہ اس عرصے میں وہ ایک نامور سائنس دان بن گئے۔ انہوں نے انسانی صحت کے بارے میں تحقیق میں پروفیسر دانش کی بہت مدد کی اور اب وہ سرطان کے بارے میں خود بڑی اہم تحقیق کر رہے تھے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جب کسی خرابی کی وجہ سے ہمارے جسم کے کسی بھی حصے کے خلیے تعداد میں تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں اور ان کے اضافہ پر جسم کا کوئی قابو نہیں رہتا تو پھر سرطان یعنی کینسر ہو جاتا ہے۔ 1983ء میں سائنس دانوں نے یہ پتا چلایا کہ چوہے کے خلیوں کی جین میں کیا رد و بدل کیا جائے کہ ان کی تعداد بے تحاشہ بڑھنے لگے اور وہ سرطان کی شکل اختیار کر لیں۔ 20ویں صدی کے آخر میں ان ہی سائنس دانوں نے یہ تجربہ چوہے کے بجائے انسان کے خلیوں پر کیا۔ ان سائنس دانوں کا خیال یہ تھا کہ اگر وہ جسم میں سرطان پھیلانے کا طریقہ جان لیں تو پھر وہ سرطان کے خلیوں کو تباہ کرنے اور سرطان سے چھٹکارا پانے کا طریقہ بھی دریافت کر لیں گے۔

ڈاکٹر ذہین نے پروفیسر دانش کی رہ نمائی میں اس تحقیق کو مکمل کر لیا اور کچھ ہی دن میں وہ اس کا اعلان کرنے والے تھے کہ غائب ہو گئے یا انہیں غائب کر دیا گیا۔ فیچر میں کسی کا نام تو نہیں دیا گیا تھا لیکن یہ اندیشہ ضرور ظاہر کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر ذہین کو حسد کی وجہ سے اغوا کیا گیا ہے۔ دراصل انسان سے یہ بات

برداشت نہ ہوئی کہ اس کا دماغ جہاں بیسوں سال میں پہنچ پاتا ہے وہاں ایک بن مانس کا دماغ سات آٹھ سال میں پہنچ جائے اور وہ بھی اتنی کامیابی سے۔ ڈاکٹر ذہین کو اغوا کرنے والے یہ بھی بھول گئے کہ انہیں غیر معمولی ذہانت دینے والا بھی ایک انسان ہی ہے اور ڈاکٹر ذہین کی ذہانت ایک انسان کی دماغی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔

اس فیچر نے سارے ملک میں کھلبلی مچادی۔ ہر طرف سے یہی آواز سنائی دے رہی تھی کہ ڈاکٹر ذہین کی گم شدگی کو ملک کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیا جائے اور یہ معمہ جلد سے جلد حل کیا جائے۔

اس دوران میں ایک دن ڈاکٹر ماہر پروفیسر دانش سے ملنے آئے اور ایک کاغذ انہیں دیتے ہوئے بولے:

"پروفیسر دانش! میں آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے ایک ہفتہ کی چھٹی اور ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دیں گے"۔

پروفیسر دانش نے کاغذ پڑھتے ہوئے کہا "ماہر! میں بڑی خوشی سے آپ کو جانے دیتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ آج کل ڈاکٹر ذہین کی گم شدگی کے بارے میں دو تین ادارے تحقیقات کر رہے ہیں۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ آپ کی موجودگی ضروری ہے"۔

ڈاکٹر ماہر نے کچھ ناراض ہوتے ہوئے کہا "کیوں؟ میری موجودگی کیوں ضروری ہے؟ میرا اس سے کیا تعلق ہے؟"

پروفیسر دانش نے بڑے دھیمے انداز میں کہا "صرف آپ کی ہی نہیں ہم سب کی موجودگی ضروری ہے۔ اس واقعہ سے ہم سب کا تعلق ہے۔ آخر ڈاکٹر ذہین ہم سب کے ساتھی ہیں"۔

ڈاکٹر ماہر اس جواب سے مطمئن تو نہیں ہوئے لیکن خاموش ہو گئے۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں رکھے ہوئے سگار باکس میں سے ایک سگار نکال کر سلگایا۔ پروفیسر دانش کی نظر بھی سگار باکس پر پڑ گئی اور وہ چونک پڑے۔ ڈاکٹر ماہر بریف کیس بند کرنے لگے تو پروفیسر نے ان سے اچانک سوال کیا۔

"ڈاکٹر ماہر! یہ سگار باکس آپ کے پاس کیسے آیا؟"

ڈاکٹر ماہر نے سگار باکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں خیریت تو ہے؟ کیا آپ کو اس پر بھی اعتراض ہے؟"

پروفیسر دانش نے اب ذرا چڑچڑے پن سے کہا "بات اعتراض کی نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ انعامی تقریب کے دن تک جو سگار باکس ڈاکٹر ذہین کے پاس تھا اور سال بھر سے ان کی ملکیت تھا وہ ان کے گم ہونے کے بعد آپ کے پاس کیسے پہنچ گیا؟"

ڈاکٹر ماہر اس سوال سے کچھ گھبرا سے گئے لیکن انہوں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "پروفیسر! کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ سگار باکس خود ڈاکٹر ذہین نے مجھے دیا ہو؟"

"ناممکن" پروفیسر دانش نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اب ڈاکٹر ماہر کو بھی غصہ آنے لگا۔ وہ اونچی آواز میں بولے "تو آپ کو مجھ پر شبہ ہے کہ....."

پروفیسر دانش نے بات کاٹی "....جی ہاں اور اب یہ شبہ یقین میں بدل رہا ہے"۔

ابھی اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ وڈیو فون کی گھنٹی بجی اور اسکرین پر پولیس چیف کی تصویر نظر آئی۔ پروفیسر نے بٹن دبایا تو آواز آئی۔ "میں 10 منٹ میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ معمہ حل ہو گیا ہے۔ آپ کے کمرے میں ڈاکٹر ماہر بھی نظر آ رہے ہیں۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ انہیں روکے رکھئے گا"۔

پروفیسر دانش نے فاتحانہ انداز میں ڈاکٹر ماہر کی طرف دیکھا جو خاصے پریشان نظر آ رہے تھے اور مسلسل دانتوں سے اپنی انگلیوں کے ناخن کاٹ رہے تھے۔ پولیس چیف 10 منٹ کے اندر ہی وہاں پہنچ گئے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے بولنا شروع کر دیا۔

"ڈاکٹر ذہین کا یہ پیغام کچھ دیر پہلے ہمیں ملا ہے۔ یہ ہم تک کس طرح پہنچا؟ اس کے بارے میں فی الحال میں کچھ نہیں بتا سکتا

لیکن یہ بات یقینی ہے کہ پیغام ڈاکٹر ذہین کا ہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پروفیسر دانش نے مجھے پستی سے اٹھا کر بلندی پر پہنچایا۔ اتنی بلندی پر کہ میں ذہانت میں انسان کو پیچھے چھوڑ گیا۔ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ایک انسان کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے میں پوری انسانیت کی خدمت کروں۔ میں نے انسانی جسم میں سرطان پھیلانے والے خلیے بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تو یہ کوشش شروع کی کہ اب ان خلیوں کو تباہ کرنے کا طریقہ بھی دریافت کروں تاکہ انسان کو اس موذی مرض سے نجات مل جائے۔ ابھی میں نے یہ کام شروع کیا ہی تھا کہ ہر طرف سے مجھ پر دباؤ پڑنے لگا کہ میں اپنی تحقیق کو سرطان والے خلیے بنانے پر ہی ختم کر دوں اور علاج دریافت نہ کروں۔ مقصد یہ تھا کہ ان سرطانی خلیوں کو اپنے دشمن یا مخالف کے خلاف استعمال کر کے تباہی پھیلائی جائے۔ مجھے دھمکی دی گئی کہ اگر میں نے یہ بات نہ مانی تو جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ عجب بات تھی کہ ایک طرف تو میں ایک عالمی ادارے سے انسانی خدمت کے صلے میں اعزاز اور انعام وصول کروں اور دوسری طرف انسان کی تباہی کا انتظام کروں۔ میں نے سوچا کہ انسان کی تباہی کے لئے خود انسان کیا کم ہے جو میں یہ گناہ اپنے سر لوں۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ انسانوں کے اس شہر سے جنگل کا رخ کروں اور اپنی برادری میں جا کر رہوں۔ ڈاکٹر ذہین کی حیثیت سے نہیں بلکہ بن مانس کی حیثیت سے۔ جہاں مجھے کوئی انسان پہچان بھی نہ سکے۔

اگر عالمی ادارہ انعام کی رقم دے دے تو اسے میری طرف سے ڈاکٹر ماہر کو دے دیا جائے جنہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری ادھوری تحقیق کو پورا کریں گے۔ ڈاکٹر ماہر ہمیشہ میری مخالفت کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں انہوں نے میری ہمت بندھائی کہ میں انسان کی تباہی کے لیے کوئی قدم نہ اٹھاؤں"

پروفیسر دانش نے پیغام سنا تو ان کی آنکھوں سے دو آنسو میز کے شیشے پر ٹپک پڑے۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر ڈاکٹر ماہر کی طرف دیکھا اور کہا:

"ڈاکٹر ماہر! آپ عظیم انسان ہیں"۔

ڈاکٹر ماہر نے مسکراتے ہوئے کہا

"لیکن ڈاکٹر ذہین بن مانس سے کم"۔

کھیلوں کی دنیا

قسط 6

کرکٹ کیا اور کیسے؟

این الطاف

اسپن بولنگ

اسپن بولنگ(SPIN BOWLING) سے مراد گیند آہستہ پھینکتے ہوئے گھمانا ہے۔

کام یاب اسپن بولنگ کے لیے اسپن گیند کے فن کا علم اور وسیع تجربہ ہونا لازمی ہے۔ ایک اسپنر کو بہت زیادہ بولنگ اور خاصی مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسپن اور فلائٹ گیندیں کرانے کی پیچیدگیاں اتنی ہیں کہ بولنگ کے اس انداز میں مہارت حاصل کرنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ اس لیے ایک اسپنر کو ون ڈے کرکٹ میں دیگر انداز کی بولنگ میں اپنا وقت اور صلاحیتیں ضائع نہیں کرنی چاہئیں۔

عام طور پر اسپن بولنگ دو قسموں کی ہوتی ہے۔ ایک فنگر اسپن اور دوسری ریسٹ اسپن جن کو دوسرے الفاظ میں آف اسپن اور سلو لیفٹ آرم بولنگ بھی کہا جاسکتا ہے۔

آف اسپن

آف اسپن OFF SPIN یا فنگر اسپن بولنگ میں جب گیند کو اسپن کیا جاتا ہے تو یہ پچ ہونے کے بعد بلے باز کی طرف لپکتی ہے۔ اس طرح یہ گیند کو اسپن کرنے کا قدرتی انداز ہے۔ کیوں کہ یہ آف اسپنر کے ہاتھوں سے ان مرحلوں کے بغیر نکلتی ہے جن سے ایک ریسٹ اسپنر کو گیند پھینکتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک اسپنر کے لیے سب سے اہم بات ٹرن کے بجائے باؤنس ہے۔ اچھا اسپنر بننے کے لیے ایک بولر سب سے پہلے گیند کو اسپن کرانا سیکھتا ہے اور پھر وہ طریقہ سیکھتا ہے جس کے ذریعے لائن اور لینتھ کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔

آف اسپن بولنگ میں فاسٹ بولنگ کے برعکس گیند کو انگلیوں کے ذریعے سیم (Seam) کے نیچے سے پکڑنے کے بجائے ترچھا پکڑا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کو فنگر اسپن (FINGUR SPIN) بولنگ بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بہترین گرفت یہ ہے کہ گیند کو بیچ کی انگلی اور دوسری انگلی کے ذریعے پکڑا جائے۔ جب کہ انگوٹھا گیند کے پیندے کے ایک طرف اور تیسری انگلی بھی اس کے قریب تر ہو، جس کا اس گرفت میں برائے نام حصہ ہو۔ اس طرح ایک اسپن بولر کو

سب سے زیادہ اسپن مل سکتی ہے۔ مگر ہر بولر کے اتنے بڑے ہاتھ اور انگلیاں نہیں ہوتیں کہ وہ صرف دو انگلیوں سے گیند کو پکڑ کر اسے کنٹرول کر سکے۔ خصوصاً بچوں کے لیے تو ایسا کرنا خاصا مشکل ہوگا۔ لہٰذا وہ افراد جن کے ہاتھ چھوٹے ہوں گیند پکڑتے ہوئے اپنی تیسری انگلی سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں کلائی کا رخ انگوٹھے کی طرف ہوتا ہے۔ تاکہ اس وقت جب انگلیاں گیند کی سلائی (Seam) پر ہوں تو کلائی کی مدد سے گیند کو جھٹکا دیا جا سکے۔ بہر حال یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہر صورت میں بیچ کی انگلی ہی ہوتی ہے جو گیند کو اسپن دیتی ہے۔ اسپن بولنگ کا انداز وہی ہوتا ہے جو آؤٹ سونگر پھینکتے وقت دیکھنے میں آتا ہے۔

اسپن بولر اتنی بڑی جست نہیں لیتے جتنی کہ ایک فاسٹ بولر کو لینی پڑتی ہے۔ پھر بھی ایک اسپن بولر کے لیے رن اپ لینا مناسب ہے تاکہ اس کے بازو تیزی سے گھومیں۔

اسپن بولر کے لیے سائیڈ وے اپنانا لازمی ہے۔ اس قسم کی بولنگ میں اگلا پیر ترچھا ہونا چاہیے جس طرح کہ آؤٹ سونگر پھینکتے ہوئے ہوتا ہے۔ اپنے سامنے والے بازو کو بھی اسی طرح استعمال کرنا چاہیے۔
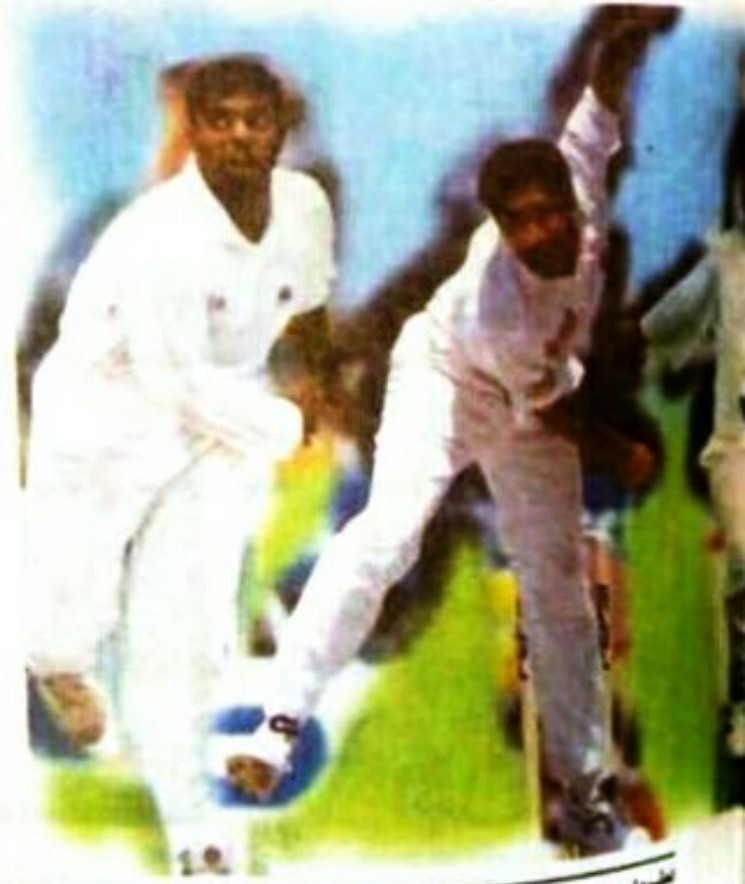
اسپن بولنگ میں بھی بولر اپنا پورا جسم استعمال کرتا ہے۔ بہترین اسپن بولر بولنگ کے لیے دوڑتے ہوئے اچھلتے ہیں۔ ایک اچھا اسپنر بننے کے لیے آپ بھی جتنا اونچا اچھل سکتے ہیں اچھلیں۔ اس سے نہ صرف گیند کو اسپن کرنے میں مدد ملے گی بلکہ اس سے زیادہ باؤنس بھی ملے گا۔ کیوں کہ بلے باز کے لیے اسپنر کا باؤنس بھی اتنا ہی پریشان کن ہوتا ہے جتنا خود اسپن بولر۔

اگر آپ اسپن بولر ہیں تو گیند کرانے سے پہلے اس بات کا یقین بھی کر لیں کہ آپ کی کمر بالکل صحیح پوزیشن میں ہو۔ اگرچہ انگلیاں ہی گیند کو اسپن دیتی ہیں مگر پورا جسم حرکت میں آکر گیند کی قوت بڑھا دیتا ہے۔ اس سلسلے میں بولر کا فالو تھرو بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ورائٹی پیدا کرنے کے لیے کریز کی پوری چوڑائی کو استعمال کرنا مناسب ہوتا ہے۔ بولر کو اپنی اسٹاک بال اسٹمپ کے بالکل قریب سے پھینکنی چاہیے۔ اس سے گیند کی سمت صحیح رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

ایک آف اسپنر کا سب سے بڑا ہتھیار اس کی آف بریک گیند ہے جو بلے باز کے اندر کی طرف آتی ہے۔ ایک ایسی وکٹ پر جو آف اسپنر کی مدد کر رہی ہو' ایسی گیند مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر ایسی گیندوں کا بلے باز کو پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔ لہٰذا ایک ایسی وکٹ پر جو بالکل مدد نہ کر رہی ہو وہاں آف اسپنر کو کچھ اور ترکیبیں بھی آزمانی پڑتی ہیں۔ یوں تو یہ بات سب بولروں کے لیے ضروری ہے مگر آف اسپنر کے لیے تو یہ لازمی ہے کہ بلے باز اسے آسان نہ سمجھے۔

ایک اسپنر آف بریک کے لیے مندرجہ ذیل انداز اپنا سکتا ہے۔

آرم بال ARM BALL

یہ گیند بازو کی قوت سے کی جاتی ہے' موڑ کر نہیں۔ یہ گیند اسٹمپ کے قریب سے پھینکنی چاہیے اور یہ آف اسٹمپ یا مڈل اسٹمپ پر گرے تو یہ یا تو سیدھی آف کی طرف جائے گی یا

مڑ کر سلپ کی طرف نکل جائے گی۔ آرم بال کے بارے میں خاصی پراسراریت پائی جاتی ہے۔ زیادہ تر یہ ایسی آف بریک گیندیں ہوتی ہیں جو ٹرن نہیں ہوتیں۔ اس گیند کو پھینکنے کے مختلف طریقے ہیں۔ کچھ بولر گیند ہاتھوں میں گھما کر کرتے ہیں جس سے بیچ کی انگلی ترچھی آنے کے بجائے سیدھی سلائی یعنی سیم پر آجاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیچ کی انگلی جو اسپن پیدا کرتی ہے سیم کے بجائے چکنی سطح پر پھسلتی ہے۔ ایک اور طریقہ وہ ہے جسے فاسٹ بولرز کم رفتار کی گیندیں پھینکنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اس انداز میں گیند کو ہتھیلی پر رکھا جاتا ہے۔ اس میں بھی مجموعی طور پر گرفت وہی رہتی ہے۔ انگلیاں گیند کے اوپر آجاتی ہیں جب کہ بولنگ اسی ایکشن سے کی جاتی ہے۔

فلوٹر یا ڈرفٹر

فلوٹر یا ڈرفٹر (Floater or Drifter) بھی ایک آف اسپنر پھینکتا ہے۔ یہ ایسی گیند ہے جو بڑے نمایاں انداز میں پہلی سلپ کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اسے پھینکنے کا ایک پسندیدہ طریقہ آؤٹ سوئنگر پھینکنا ہے مگر یہ چھپ چھپا کر پھینکنا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ بیچ کی انگلی اور دوسری انگلی کا ایک دوسرے سے فاصلہ اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیے جتنا کہ ایک عام آؤٹ سوئنگر پھینکتے ہوئے ہوتا ہے۔ فلوٹر گیند پھینکنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ گیند اس طرح پکڑی جائے جیسے ایک عام آف اسپنر پکڑتا ہے۔ مگر گیند پھینکتے وقت کلائی کو گھما دیا جائے۔ اس طرح ہاتھ کے سامنے والے حصے کے بجائے ہاتھ کا بغلی حصہ بلے باز کا سامنا کرے۔ اس کا مطلب ہے کہ گیند افقی کے بجائے عمودی سمت میں اسپن کرے گی اور اس صورت میں یہ فضا میں تیرتی ہوئی سلپ میں جائے گی۔

ایک آف اسپنر کے درحقیقت کئی "اسٹنڈرڈ ویری ایشن" یا معیاری انداز ہوتے ہیں۔ اسپن بولر گیند کی رفتار، فلائٹ لائن اور لینتھ بدل ڈالتا ہے۔ اگر ایک آف اسپنر تیز یارکر یا باؤنسر پھینک سکے تو یہ اس کا ایک اضافی ہتھیار ہوگا۔ آف اسپنر کا ایک اور ہتھیار یہ ہے کہ وہ بلے باز کو سرپرائز دے اور بلے باز کو پتا ہی نہ ہو کہ آف اسپنر کس قسم کی گیند پھینکنے والا ہے۔

یوں تو اسپن بولنگ میں بھی وہی بنیادی اصول کارفرما ہوتے ہیں جو دوسری قسموں کی بولنگ میں ہوتے ہیں لیکن ایک آف اسپنر کے لیے خاص طور پر ضروری ہے کہ وہ جرات مندی سے بولنگ کرے، ذہن کو ہر وقت کھلا رکھے، سر کو ہلنے نہ دے، جسم کو اسی طرح استعمال کرے جس طرح فاسٹ بولر کرتا ہے۔ اسی سے اس کا مومینٹم بنتا ہے۔ سر کو ساکت رکھنا اگر سارے بولروں کے لیے ضروری ہے تو یہ اسپنرز کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ ان کے پاس غلطی کی گنجائش سب سے کم ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ)

عالمی شہرت کے حامل
اسپن بالر
عبدالقادر
بالنگ کے چار
مختلف انداز

شاہد ریاض شاہد
کارٹون کہانی
گنجو میاں' ملاجی' ملک اور بسنت
بسنت کی رات تھی ملا نصر الدین اور گنجو میاں خریداری کے لیے بازار گئے۔ ملا نے وہاں سے ایک قیمتی کمبل بھی خریدا
ملا آپ کا کمبل بہت خوب صورت ہے
کیوں نہیں' لیجئے' یہ آپ ہی کا ہے۔
ملا مجھے ذرا کمبل دیجئے' میں ڈور کے پیچ خریدنے جارہا ہوں
تھوڑی دور چلنے کے بعد راستے میں ان کو ملک صاحب مل گئے ملک صاحب نے ملا سے کمبل ادھار مانگ لیا
ملک صاحب تو کمبل لے کر چلے گئے مگر ملا کوئی نئی شرارت سوچنے میں مصروف ہوگئے
کیوں نہ آج رات ملک کی ڈور پر ہاتھ صاف کیا جائے
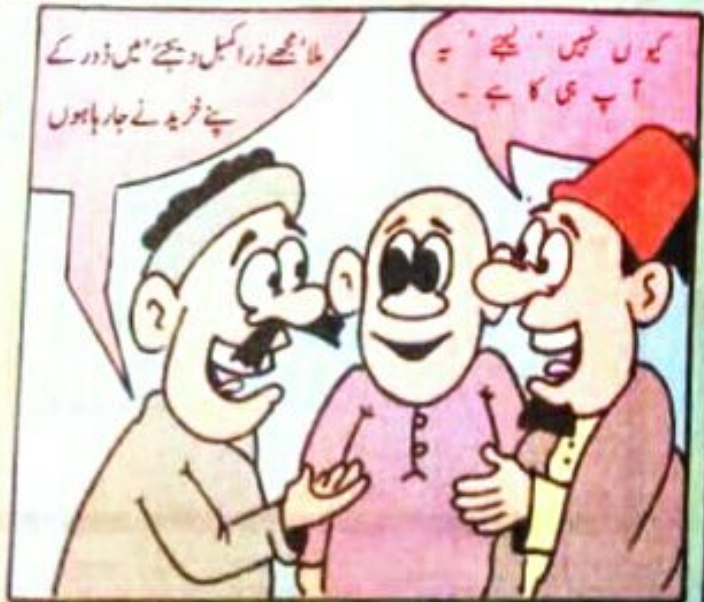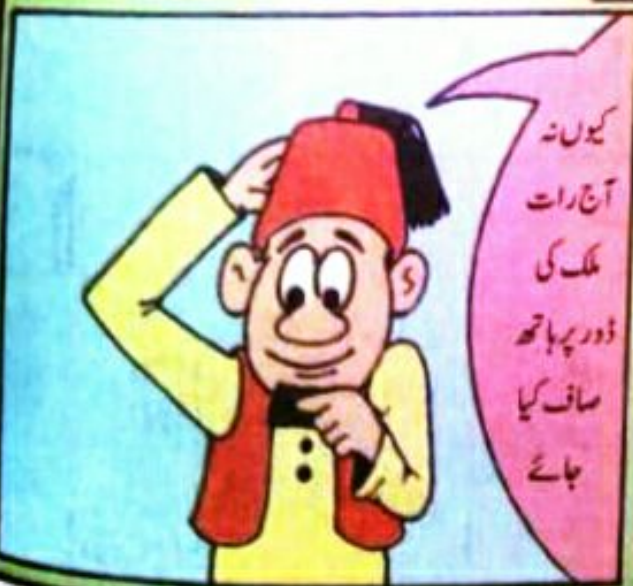
اب ملا ملک صاحب
کے گھر کے پاس پہنچے اور
کھڑکی سے ہاتھ ڈال
کر ڈور کا سرا تلاش کیا
واہ۔۔۔۔ ڈور تو کافی
مضبوط دکھائی دیتی ہے
ملا نے دو تین
ڈور کے پنے بنا لے
پھر اچانک ڈور ٹوٹ
گئی۔ ملا پھر
بھی خوش تھے
ہائیں ڈور تو ٹوٹ گئی۔ چلو کوئی بات
نہیں کافی اکٹھی ہو گئی ہے
ملا جب گھر
آئے تو تھوڑی دیر
بعد ملک صاحب بھی
آگئے۔ وہ ملا کا آدھا
کمبل لائے اور جلدی جلدی
ملا کو بتایا
ملا
ملا
میں نے
آپ کا کمبل
کھڑکی میں
رکھا تھا کوئی
آدھا اتار
کر لے گیا
دراصل ہوا یہ
کہ ملا نے کھڑکی میں سے
جو ڈور پکڑی تھی وہ ان کے
اپنے ہی کمبل کا دھاگا تھا اور
ملا اسے ڈور سمجھ
کے پنے بناتے رہے
ارے ملا تو نے تو اپنے ہی کمبل
کا ہاتھ صاف کر دیا

یہ قصہ ہے میرا اور ایک ایسے جانور کا جو عام طور پر ہمارے درمیان رہتا ہے۔ یہ جانور پالتو ہو تو اتنا وفادار کہ اپنے مالک کے لیے جان بھی قربان کر دے' ورنہ اپنی حیوانگی پر آئے تو خون خواری میں کسی درندے سے کم نہیں۔ اس سے سبھی واقف ہیں یعنی "کتا"۔

یہ جو واقعہ میں لکھ رہا ہوں' حقیقتاً میرے ہی ساتھ پیش آیا تھا۔ اس وقت میں فرسٹ ائر کا طالب علم تھا۔ میں اپنے والدین اور دیگر بھائیوں' بہنوں کے ہمراہ جس مکان میں رہتا تھا' وہ بہت مختصر اور خاندان کے تمام افراد کی ضروریات کے لیے ناکافی تھا۔ سالانہ امتحانات بادلوں کی طرح تیزی سے امڈے چلے آ رہے تھے۔ میں اپنی پڑھائی کے لیے مناسب ماحول اور جگہ نہ ہونے سے سخت فکر مند تھا۔ ایک دن میرے چچا جان' گھر تشریف لائے تو ان کو میری پریشانی کا علم ہوا۔ دوسرے دن وہ پھر آئے اور انہوں نے مجھے چابیوں کا ایک گچھا دیا۔ چچا جان کا بنگلہ زیر تعمیر تھا' مگر ان دنوں کام بند تھا۔ انہوں نے مجھے چابیاں دیتے ہوئے ہدایت کی' "خالی کمروں میں سے اپنی پسند کے کمرے میں' گلو بابا سے صفائی کروا کر میز' کرسیاں' پلنگ اور ضروری سامان رکھوالو' اور اپنی ساری کتابیں' کاپیاں' پڑھائی کا سامان' وہیں لے جاؤ۔ وہاں تمہاری پڑھائی میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا"۔

میں نے خوشی خوشی ایک کمرا پسند کیا اور اس کی صفائی کروا کر ضروری سامان کو سیٹ کرا دیا۔ پھر ایک کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ قریب ہی سے کسی کتے کے زور زور سے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں نے آواز کی طرف نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ ایک کتیا نہایت خوف ناک انداز میں بھونکتی ہوئی میرے کمرے کی طرف تیزی سے دوڑی چلی آ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور نوکیلے دانت کھلے ہوئے جبڑے سے بڑے ہول ناک لگ رہے تھے۔ میں نے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہی بجلی کی تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ ابھی چٹخنی لگا کر مڑنے بھی نہ پایا تھا کہ کتیا نے آ کر زور سے دروازے پر ٹکر ماری۔ میں بال بال بچا تھا۔ کتیا غصے سے بپھری ہوئی کمرے کے تین اطراف چکر لگانے لگی۔ وہ منہ اٹھا کر مسلسل بھونکتی جا رہی تھی۔ یہ میرے لیے بڑی نازک صورت حال تھی۔ کتیا نے کمرے کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اس سے بحفاظت نکلنے کا دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ پریشانی کے عالم میں میں جس سمت کی کھڑکی پر آتا' وہ بھی غصے میں بھونکتے ہوئے اسی کھڑکی کا رخ کرتی۔ آخر تھک ہار کر میں چارپائی پر دراز ہو گیا اور حالات کی سنگینی کا جائزہ لینے لگا۔

حقیقت حال یہ تھی کہ اس مقام پر کتیا کے بچے تھے جو کتیا کے آتے ہی نہ جانے کدھر سے نکل کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ گویا وہاں اس کتیا کی حکومت تھی' کیوں کہ ابھی اس گھر کی باہر کی دیوار تعمیر نہ ہوئی تھی اور ایسی کتیا' جیسا کہ آپ جانتے ہیں' اجنبی لوگوں کے لیے کتنی خطرناک ہوتی ہے جس کے پلے ابھی بہت چھوٹے چھوٹے ہوں۔ میں جو اس کتیا کے لیے بالکل اجنبی تھا' بھلا وہ اس عمارت میں مجھے کس طرح برداشت کرتی۔ ایسی صورت حال میں کتیا کو خود سے مانوس کرنا لازمی تھا۔ مگر یہ مشکل ترین کام کس طرح انجام دیا جائے۔ میں اس بارے میں دیر تک سوچتا رہا' مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ اس وقت تو مجھے کمرے سے بحفاظت باہر نکلنے کے لالے پڑے تھے۔ ادھر شاید کتیا بھی تھک کر عین دروازے کے سامنے براجمان ہو گئی تھی کہ "بچو! کبھی تو باہر نکلو گے"۔

کافی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔ میں نے چپکے سے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کتیا میری طرف سے غافل ہو کر اپنے پلوں کے ساتھ کھیلنے میں مگن تھی۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ کچھ بچے دودھ پی رہے تھے اور باقی اس کے ساتھ شرارتیں کر رہے تھے۔ اس وقت کتیا پوری طرح ماتا کے جذبات سے پر تھی۔ کبھی کسی بچے کو پیار سے چاٹتی اور کبھی کسی شریر پلے کو دانتوں سے پکڑ کر مصنوعی غصے سے غراتی۔

میں نے بے ساختہ سیٹی بجائی۔ تمام پلے اچھلتے کودتے کھڑکی کے نیچے آکر جمع ہو گئے اور اپنی ننھی منی دمیں ہلانے لگے۔ کتیا ایک دم غراتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور مجھ کو بڑے غصے سے گھورنے لگی۔ میں اسی طرح سیٹی بجاتا اور پلوں کو چمکارتا رہا۔ کتیا کا غصہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑتا گیا۔ اس کا بھونکنا غراہٹ میں بدلتا گیا اور غراہٹ بھی دھیرے دھیرے مدھم پڑتی گئی۔ اب وہ کبھی کبھار اپنی دم کو، جو پہلے کسی تلوار کی طرح سیدھی اوپر تنی ہوئی تھی، آہستہ آہستہ ہلانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس دروازے کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔

میں نے دل کڑا کر کے چٹخنی کھول کر دروازے کو تھوڑا سا کھولا۔ دروازے کی چرچراہٹ سن کر کتیا نے تیزی سے گھوم کر دیکھا مگر وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ میں نے پیار سے چمکار کر سیٹی بجائی۔ کتیا نے آہستہ سے اپنی دم لہرائی۔ گویا میری دوستی کی پیش کش قبول کر لی اور اپنے غصے کو محبت میں تبدیل کر لیا۔

میں نے دروازے کو کچھ اور کھولا، ادھر کتیا نے بھی اپنے رخ کو بدلا۔ آخر کار میں نے دونوں پٹ کھول دیئے، اس کے ساتھ ہی کتیا کے جبڑے خوشی سے کھل گئے۔ پھر میں نے بڑھ کر آہستہ سے، مگر دھڑکتے دل سے، ڈرتے کانپتے، کتیا کے سر پر لرزتا ہوا ہاتھ پھیرا۔ اس نے ہلکی سی غراہٹ سے اپنا رخ پھیرا۔ سر اٹھایا، تھوتھنی آسمان کی طرف بلند کی۔ میں اسی طرح اس کے سر کو سہلاتا رہا۔ ادھر کتیا ہلکی غراہٹ کے ساتھ اپنی دم کو پنکھے کی طرح جھلتی رہی۔ پھر اس کی غراہٹ رفتہ رفتہ پیاؤں پیاؤں کی باریک آواز میں تبدیل ہو گئی اور اس کے بعد سیٹی جیسی آواز اس کے منہ سے نکلنے لگی۔ اس پر میں نے مزید جرات کر کے اس کے پورے جسم پر ہلکی تھپکیاں دیتے ہوئے اسے سہلانا شروع کر دیا۔ اس پر تو گویا کتیا نے یک بارگی اپنے سارے ہتھیار ڈال دیئے اور مزے سے لیٹ گئی۔ اپنی آنکھیں موند لیں اور دم کو مسلسل لہرانے لگی۔ گویا دوستی کا پائے دار سمجھوتہ ہمارے درمیان ہو گیا۔ میری خوشی کا تو جیسے کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔

کتے، جن کی غراہٹ اور بھونکنے کی آواز سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو جاتے تھے، اس کارہائے نمایاں پر، جو بالکل غیر متوقع طور پر مجھ سے 'بحالت مجبوری' سرزد ہو چکا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ آیا یہ وہی خون خوار کتیا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے جس کی خوف ناک غراہٹ اور بھونکنے سے میں اسی کمرے میں انتہائی خوف کے عالم میں قید تھا، اچانک اس طرح آسانی سے رام ہو جائے گی۔

میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں فوراً دوڑا دوڑا اپنے گھر آیا اور اپنی نئی دوست کتیا کی خاطر مدارات کے لیے اس کی پسندیدہ خوراک کی ڈش لے کر واپس گیا۔ پھر اپنے ہاتھوں سے، چمکار چمکار کر اسے کھلانے لگا۔ اس کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ وہ مجھ کو دور سے دیکھتے ہی کوں کوں کی آوازیں نکالتی، دوڑتی ہوئی آتی اور میرے چاروں طرف دم ہلاتی، کوں کوں کرتی چکر لگاتی۔ زیادہ لاڈ میں آتی تو میرے پیروں کے بیچ میں لیٹ جاتی۔ میں حرکت کرتا تو تلملا کر پھر سرک کر لیٹ جاتی اور جانے نہ دیتی۔ میں پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتا تو وہ خوشی سے خوب اچھل کود کرتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کتیا جو آج میرے گرد لوٹ رہی ہے چند روز پہلے اسی کی وجہ سے میری جان پر بنی ہوئی تھی اور میں اس کی قید سے رہا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ پیار ہی ایک ایسی طاقت تھی جس نے اس کتیا کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

واقعی مخلص پیار ایک ایسی عالم گیر زبان ہے، جس کو صرف انسان ہی نہیں بلکہ ہر جان دار بھی خوب سمجھتا ہے اور اس کا جواب بھی اسی طرح مخلص محبت اور پیار کی عالم گیر زبان میں دیتا ہے"۔

سیدھی لکیریں

شاہد ریاض شاہد

آپ بھی لکھیے

سہارا

عصمت جبیں بٹ، لاہور

احمد اور صوفیہ دونوں بہن بھائی محلے کے بچوں کے ساتھ صحن میں کھیل رہے تھے۔ اس کھیل میں ایک بچے کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور وہ آوازیں سن کر معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کون کس جگہ ہے۔ جب کہ باقی بچے اسے چھیڑتے۔ وہ کبھی ایک کے پیچھے بھاگتا کبھی دوسرے کے۔ جو پکڑا جاتا اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کے نابینا کا رول ادا کرنا ہوتا تھا۔ اب حسن پکڑا گیا اور دوسرے اسے آوازیں دینے لگے۔

حسن کو سب خوب تنگ کر رہے تھے کہ اتنے میں اس نے لپک کے ایک کو پکڑ لیا۔ "پکڑے گئے، پکڑے گئے" حسن زور زور سے چلا رہا تھا کہ یک دم سب ہنسنے لگے۔ حسن نے آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو سامنے دادا جان کھڑے تھے۔ جونہی حسن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے ان کا سفید کرتا چھوڑ دیا۔

"بھئی بچو! آپ لوگ صبح سے کھیل رہے ہو نا کہ چھٹیاں ہیں لیکن چھٹیاں صرف کھیلنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ ساتھ ساتھ ہوم ورک بھی کرنا چاہیے۔ چلو شاباش اب گھروں کو جاؤ اور کھانا کھا کے پڑھائی پر توجہ دو" دادا ابو نے انہیں سمجھایا۔

"ٹھیک ہے دادا جان" سب بچے یک زبان ہو کر بولے۔

"احمد بیٹا"

"جی دادا ابو" احمد فرماں برداری سے بولا۔

"بیٹا! میری عینک تو ڈھونڈ دو، کوئی دو گھنٹے سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ میرے دوست کا خط آیا ہے اس کا جواب لکھنا ہے"۔

"آپ کی عینک ننھی مونا نے لگا رکھی تھی اور اس کے ساتھ کھیل رہی تھی میں دیکھتا ہوں کہ اس نے کہاں رکھی ہے"۔

"مونا! مونا!" احمد اپنی تین سالہ بہن کو پکارتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ لیکن جونہی وہ اندر آیا امی نے اس کے آگے کھانا رکھ دیا اور کھانا کھانے کے بعد وہ سو گیا۔ دادا ابو کی عینک ڈھونڈنا اسے یاد ہی نہ رہا۔

اگلی صبح اتوار تھا اور ناشتے کی میز پہ ہی ایک خوش خبری سن کر سب بچوں کے چہرے کھل گئے۔ ابو جان نے بتایا کہ وہ سب کو چڑیا گھر کی سیر کروانے لے جا رہے ہیں۔

"آہا! ہم ہاتھی کی سواری کریں گے" احمد چہک کے بولا۔

"بھائی! وہاں شیر بھی ہوگا" صوفیہ نے کہا۔

"ہاں ہاں" احمد نے کہا "اور مونا کو بھی شیر دکھائیں گے"۔

"شے؟ بب شے؟" مونا تتلا کے بولی۔

"سب تیار ہو گئے؟ چلو گاڑی میں بیٹھو" احمد کے ابو نے کہا۔

"ابو جان! وہ دادا ابو سے تو پوچھا ہی نہیں" احمد کچھ ہچکچا کر بولا۔

"آں؟ اچھا میں پوچھتا ہوں" ابو جلدی سے بولے۔

دادا جان اپنے کمرے میں عینک تلاش کر رہے تھے، ان کا سفید باریش نورانی چہرہ کچھ متفکر سا تھا۔

"السلام علیکم، اباجی! میں بچوں کو چڑیا گھر لے جا رہا ہوں، آپ ساتھ چلیں گے؟"

"احمر پتر، وعلیکم السلام، تم بڑے دنوں کے بعد میرے کمرے میں آئے ہو، بیٹھو تو سہی" دادا جان بے تابی سے بولے۔

"نہیں اباجی، بچے گاڑی میں بیٹھے ہیں، آپ نے چلنا ہے؟"

"آہ بیٹا، میرے گھٹنوں میں درد ہے، مجھ سے کہاں چلا جائے گا۔ ایک لاٹھی مل جائے تو اس کے سہارے چل سکوں" دادا جان افسردگی سے بولے۔ "تم بچوں کو لے جاؤ۔ اللہ آپ سب کو

اپنی حفظ و امان میں رکھے"۔ وہ دعائیں دینے لگے۔

سارا دن چڑیا گھر کی سیر میں گزر گیا' شام ڈھلے سب واپس آئے تو احمد سیدھا دادا ابو کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"احمد" امی نے آواز دی "پہلے نہالو' پھر کچھ کرنا"۔

"جی امی" احمد باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ جب سارے بچے نہا دھو کر فارغ ہو گئے تو دادا جان کے کمرے میں محفل سج گئی اور دادا ابو انہیں بچی کہانی سنانے لگے' یہ کہانی قیام پاکستان کی تھی۔ دادا جان نے بچوں کو بتایا کہ پاکستان لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی جانوں کے نذرانے کے بعد قائم ہوا تھا۔ پھر دادا جان نے انہیں اپنا خاندانی بلیک اینڈ وائٹ البم بھی دکھایا جو بچوں نے بڑے شوق سے دیکھا۔

"دادا ابو' یہ چھوٹا سا بچہ کون ہے' جو آپ نے گود میں اٹھا رکھا ہے؟" احمد نے پوچھا۔

"یہ احمر ہے' تمہارا باپ" دادا ابو کے چہرے پہ سکون پھیل گیا تو احمد کو احساس ہوا کہ دادا جان کو ابو سے کتنی محبت ہے۔ "کیا ابو کو بھی دادا ابو سے اتنی محبت ہے؟" وہ سوچنے لگا۔

"اچھا بچو' یہ دیکھو ننھی مونا' یہیں سو گئی ہے اب آپ بھی سو جاؤ۔ شب بخیر"۔ اس طرح یہ محفل برخاست ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد اسکول کھل گئے تو احمد اور صوفیہ پڑھائی میں مگن ہو گئے۔

"بھائی" ایک دن صوفیہ نے کہا "ہم نے کافی دنوں سے دادا ابو سے کوئی کہانی نہیں سنی"۔

"ہوں' آج ضرور سنیں گے" احمد نے کہا۔

لیکن جب وہ دادا جان کے کمرے میں گئے تو وہ بخار سے تپ رہے تھے۔

"دادا ابو' آپ کو بخار ہے؟ آپ دوائی لے آئیں"

"احمد بیٹا' مجھ سے چلا جائے تو دوائی لاؤں نا" دادا جان کراہ کے بولے "ایک لاٹھی مل جائے تو اس کے سہارے چل سکوں"۔

احمد نے دادا جان کے سفید چہرے کی طرف دیکھا تو جیسے اس کے اندر کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ پھر احمد ایک عزم کے ساتھ بولا "دادا جان' نہیں' میں آپ کی لاٹھی ہوں' آپ میرے کندھے پہ ہاتھ رکھیں' میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا' بلکہ آج سے میں یہیں سویا کروں گا تا کہ آپ کا خیال رکھ سکوں"۔

دادا جان نے اپنی بیماری کو بھلا کے احمد کو گلے سے لگا لیا۔ واقعی انہیں سہارا مل گیا تھا۔ (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

وطن کے جانباز

ضیا چودھری' لاہور

صبح کے ٹھیک 8 بجائے ایجنٹ کے ٹائن اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ اگرچہ کے ٹائن کا اصل نام اکرم تھا مگر وہ بہادری کے کارناموں کی وجہ سے پاک فوج کے خفیہ محکمے میں اور تمام لوگوں میں شیر دل کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سر سے ٹوپی اتاری اور اسے ایک طرف لگے ہینگر پر ٹانگ دیا۔ اس کے سامنے وسیع چمکدار میز پر چند ضروری فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ شیر دل نے ان میں سے ایک فائل اٹھا کر کھولی اور ابھی اس کا بغور مطالعہ شروع کیا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شیر دل نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ "ہیلو کے ٹائن' ملک و قوم کو ایک مرتبہ پھر تمہاری ضرورت آن پڑی ہے"۔ بولنے والا قدرے گھبرایا ہوا تھا۔ ایجنٹ کے ٹائن نے آواز کو فوراً پہچان لیا۔ یہ محکمہ خفیہ کے چیف کی آواز تھی۔

"ضرور کوئی اہم واردات ہو گئی ہے"۔ کے ٹائن نے سوچا اور بولا "چیف' آپ حکم کریں۔ شیر دل ملک پر اپنی جان تک نچھاور کر دے گا"۔

"تم 15 منٹ کے اندر اندر میرے دفتر میں آ جاؤ" چیف نے حکم دیا۔

"او کے سر' ابھی حاضر ہوتا ہوں" ایجنٹ کے ٹائن نے فائل کو وہیں چھوڑا اور اپنی جیپ کو احتیاط سے چلاتے ہوئے محکمہ خفیہ کے دفتر روانہ ہو گیا۔ ٹھیک 14 منٹ کے بعد وہ محکمہ خفیہ کے ہیڈ کوارٹر کے بالکل سامنے پہنچ چکا تھا۔ یہ شہر سے ذرا ہٹ کر پہاڑوں کے درمیان میں واقع ایک پرانی عمارت تھی جو سرسری نظر سے دیکھنے پر ایک قدیم قلعہ معلوم ہوتی تھی۔ عمارت کے اندر تمام جدید حفاظتی آلات نصب تھے۔ عمارت میں داخل ہو کر

ایک کاؤنٹر پر شیر دل نے اپنا مخصوص کارڈ کمپیوٹر میں داخل کیا تو لفٹ کا خودکار دروازہ کھل گیا۔ پانچویں منزل پر چیف کے دروازے پر لگے کمپیوٹر میں اس نے دوبارہ اپنا کارڈ داخل کیا تو وہ دروازہ بھی خود بخود کھل گیا۔ اندر ایک اونچی کرسی پر کوئی شخص نقاب پہنے بیٹھا تھا جس کے سامنے خوب صورت وسیع میز کے گرد چند کرسیاں موجود تھیں۔ نقاب پوش کے سامنے پہنچ کر شیر دل نے ایک کوڈ نمبر اور کے ٹائن اونچی آواز میں پکارا۔ "بیٹھ جاؤ شیر دل" بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

نقاب پوش جو کہ محکمہ خفیہ کا چیف تھا۔ اس نے کے ٹائن سے کہا "غضب ہو گیا شیر دل"۔

"آخر ہوا کیا؟ کچھ تو بتائیں" کے ٹائن نے بے تابی سے پوچھا۔

"دشمن ملک کے کسی جاسوس نے ہیڈ کوارٹر کے تہ خانے میں موجود ریکارڈ روم سے ایک بہت اہم فائل غائب کر دی ہے"۔

"آخر اس فائل میں تھا کیا؟" کے ٹائن نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ فائل ہمارے ملک کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ آج کل دشمن نے اپنی فوج ہماری سرحدوں پر منتقل کرنا شروع کر دی ہے اور کسی بھی وقت دشمن کا ناپاک وار ہو سکتا ہے۔ اپنی حفاظت کی غرض سے ہماری فوج کے ذہین جاسوس مختلف بھیس بدل کر دشمن کی فوج کے مختلف شعبوں میں جا پہنچے ہیں جو کہ دشمن کی ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں اور اس کے ہر ارادے کی خبر پاک آرمی کو فراہم کر رہے ہیں۔ اس فائل کے اندر ان بہادر جاسوسوں کے فوٹو گراف اور ان مقامات کی تفصیل ہے جہاں ان کو ڈیوٹی سونپی گئی ہے۔ ہماری فوج کے یہ بہادر اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اطلاعات فراہم کر رہے ہیں۔ اگر یہ فائل دشمن ملک تک پہنچ گئی تو نہ صرف وطن کے یہ جانباز دشمن کے شکنجے میں آ جائیں گے بلکہ ہماری اطلاعات کا ذریعہ بھی ختم ہو جائے گا"۔

"ایسا نہیں ہو گا سر" کے ٹائن نے چیف کی بات کو کاٹتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا "میں اس فائل کو دشمن ملک کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے واپس لے کر آؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ گنوانی پڑے"۔

"شاباش شیر دل، مجھے آپ سے یہی توقع تھی"۔

"سر! سب سے پہلے میں اس جگہ کا معائنہ کروں گا جہاں سے فائل چوری کی گئی ہے"۔

تہ خانے میں بنائے گئے سٹرانگ روم میں جہاں خفیہ دستاویزات رکھی جاتی ہیں کرنل حمید نے ایجنٹ کے ٹائن کو اس کا معائنہ کروایا۔ "وہ ایک سرخ رنگ کی فائل ہے جس کے اوپر تلوار کا نشان بنا ہوا ہے"۔ کرنل حمید نے کہا۔

"کرنل صاحب! آپ کو یہاں سے کوئی ایسی چیز تو نہیں ملی جس سے مجرم تک پہنچنے میں کوئی مدد مل سکے" کے ٹائن نے سوال کیا۔

"جی ہاں، یہ کارڈ یہاں گرا ہوا تھا۔ اس پر کوئی اجنبی زبان لکھی ہوئی ہے"۔

ایجنٹ کے ٹائن نے کارڈ کرنل سے لے کر اس کا بغور معائنہ کیا۔ شام 5 بجے شیر دل پروفیسر دانی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ پروفیسر صاحب غیر ملکی زبانوں کے ماہر تھے۔ کارڈ کا معائنہ کرنے کے بعد وہ بولے "شیر دل، یہ کسی ودیا گر نامی شخص کا کارڈ ہے جو کہ ہمارے پڑوسی ملک کے محکمہ خفیہ کا جاسوس ہے"۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ فائل کی چوری میں ہمارا پڑوسی ملک ملوث ہے" شیر دل نے کہا۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے" پروفیسر نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔

"لیکن ذلیل دشمن اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہو گا" شیر دل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو" پروفیسر نے دعا کرتے ہوئے کہا۔

پروفیسر کے گھر سے نکل کر کے ٹائن نے پڑوسی ملک کو جانے والی تمام پروازوں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ آج رات 8 بجے ایک فلائٹ پڑوسی ملک کو روانہ ہونے والی تھی"۔

ٹکٹ حاصل کر کے ایجنٹ کے ٹائن نے ہوائی اڈے کا رخ کیا۔ ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوا تو ابھی 7 بجے تھے۔ مسافر اپنے

کاغذات پر مہریں لگوا رہے تھے۔ شیر دل ایک کرسی پر بیٹھ کر ہال میں موجود تمام مسافروں کا بغور جائزہ لینے لگا۔ ہال میں طرح طرح کے مسافر موجود تھے۔ انسپکٹر کو ان میں سے کوئی بھی مشکوک نظر نہ آیا۔

"کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟" ایجنٹ جو سوچ میں ڈوبا ہوا تھا سے ایک باریک مونچھوں والے بزرگ نے پوچھا۔

"جی تشریف رکھیے" ایجنٹ نے جواب دیا۔

"ہمیں نواب شوکت مرزا کہتے ہیں۔ ہم اپنے عزیزوں سے ملنے لکھنؤ سے آئے تھے اور اس فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں"۔

"جی بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر' نواب صاحب" ایجنٹ نے جواب دیا۔ "آپ کیا نوش فرمائیں گے چائے یا کافی؟"

"کافی ٹھیک رہے گی" نواب صاحب نے بے تکلفی سے کہا "اور آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"میرا نام بشیر احمد ہے۔ تاجر ہوں اور کاروبار کی غرض سے دہلی جا رہا ہوں" ایجنٹ کے نائن نے اپنا فرضی نام اور پیشہ بتایا۔

"بہت خوب" نواب صاحب زیر لب مسکرائے۔ ویٹر انتہائی نفیس برتنوں میں کافی لے کر آیا تو ایجنٹ نے ایک پیالی نواب صاحب کو پیش کی۔ نواب صاحب نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا نہایت قیمتی سرخ ہینڈ بیگ میز پر رکھا اور کافی پینے لگے۔ کافی پیتے ہوئے شیر دل کو ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے نواب صاحب کی ایک مونچھ اپنی جگہ سے تھوڑا سا سرک گئی ہو۔ ایجنٹ کی تیز نظر کو نواب صاحب نے بھی فوراً محسوس کر لیا اور دوسرے ہی لمحے ایک ہاتھ سے مونچھ کو درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا حضرت اب اجازت دیجئے' خدا حافظ"۔

شیر دل کے ذہن میں زور دار دھماکا ہوا "تو کیا یہ نقلی مونچھوں والا شخص وہ جاسوس ہے"۔ دوسرے ہی لمحے شیر دل نے پھرتی سے جست لگائی اور جہاز کی طرف جانے والی مسافروں کی قطار میں شامل ہوتے ہوئے نواب کو جا دبوچا۔ مگر یہ نقلی نواب بھی بلا کا پھرتیلا تھا۔ آناً فاناً نہ صرف ایجنٹ کی گرفت سے نکل گیا بلکہ ایک بھرپور جوابی مکا بھی اس نے کے نائن کے چہرے پر دے مارا۔

ایجنٹ جو کہ مارشل آرٹ کا ماہر تھا' نے نہ صرف ایک ہاتھ سے دشمن جاسوس کا مکا روکا بلکہ گھٹنے کا بھرپور وار اس کے پیٹ پر کیا۔ گھٹنے کی ضرب اس قدر زوردار تھی کہ درد کی شدت سے نقلی نواب دوہرا ہو گیا۔

ان دو مسافروں کو لڑتا دیکھ کر ایئرپورٹ سیکیورٹی کے جوان بھاگتے ہوئے آئے اور انہوں نے دونوں کو گھیرے میں لے لیا۔ ایجنٹ کے نائن نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا۔ کارڈ دیکھتے ہی سیکیورٹی فورس کے انچارج نے کے نائن کو سلیوٹ کیا۔ "اسے ہتھ کڑی لگا کر باہر لے چلو" شیر دل نے حکم دیا اور فرش پر گرے ہوئے سرخ ہینڈ بیگ کو اٹھا کر کھولا تو اس کے اندر خفیہ فائل موجود تھی۔ پھر یہ قافلہ دشمن جاسوس کو ساتھ لے کر محکمہ خفیہ کے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ دوسرے دن کے تمام اخبارات نے شیر دل کا کارنامہ نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

پراسرار بوڑھا

عنبرین بتول' لاہور

پانچوں بہن بھائی بڑی بے تابی سے اپنے ماموں کا انتظار کر رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کامران' عمران اور فرحان تینوں دروازے کی طرف دوڑے۔ فرا اور صبا جو کہ ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہی تھیں' انہیں جب پتا چلا کہ ماموں جان آئے ہیں تو وہ خوشی سے ماموں کی طرف بڑھے۔ اور پھر سب بچے ماموں جان سے لپٹ گئے۔

ماموں جب بھی آتے تھے سب بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتے تھے۔ اب سب کی نظریں ماموں کے سامان پر تھیں۔ ماموں نے بچوں کا ارادہ بھانپ لیا اور کہنے لگے۔ "ہاں بھئی' تم سب کے لیے میں بہت سے تحفے لایا ہوں"

پھر انہوں نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے کھلونے اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں نکال کر سب بچوں میں بانٹ دیں۔ کھلونے لے کر بچوں کے چہرے پھول کی طرح کھل گئے اور وہ اپنی اپنی چیزیں لے کر کمرے میں آ کر کھیلنے لگے۔ شام کے وقت ماموں

نے سب بچوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں کوئی بات نیکی کرنے کے حوالے سے آگئی تو ماموں جان نے نیک کام کرنے کے فائدے بتائے۔ پھر کہنے لگے "ابھی مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں کل آؤں گا۔ آپ سب نے تب تک جو نیکیاں کی ہوں گی میں وہ آپ سے پوچھوں گا۔ جس نے سب سے اچھا کام کیا ہوگا اسے اچھا سا انعام ملے گا"۔

دوسرے دن ماموں نہیں آئے۔ سب بہن بھائی ایک دوسرے کو اپنی اپنی نیکیاں سنا رہے تھے۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ دوسرے سے سبقت لے جائے۔ باتیں کرتے کرتے وہ سب باہر صحن میں آگئے اور کھیلنا شروع کر دیا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ بچوں کی نظر اس بوڑھے پر پڑی جو ان کے گھر کے سامنے ایک درخت کے نیچے بیٹھا کراہ رہا تھا۔ وہ سب کھیل میں اتنے مگن تھے کہ کسی نے ان بزرگ کی طرف توجہ نہیں دی۔ لیکن جیسے ہی صبا کی نظر ان پر پڑی تو وہ فوراً ان کے پاس گئی اور کہنے لگی۔ "باباجی میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"بس بیٹی تھوڑا سا پانی پلا دو بہت پیاس لگی ہے" بوڑھے آدمی نے جواب دیا۔ صبا فوراً اپنے گھر سے ان بزرگ کے لیے ٹھنڈا پانی لے آئی۔ پانی پینے کے بعد وہ بزرگ وہاں سے اٹھے اور اسے دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے دن جب ماموں جان آئے تو سب بچے بہت خوش تھے۔ وہ اپنے اپنے نیک کام بڑے شوق سے سنا رہے تھے اور خوب داد وصول کر رہے تھے۔

"بھئی سب بچوں نے تو اپنی اپنی نیکیاں سنا دیں کیا صبا تم نے کوئی نیک کام نہیں کیا" ماموں جان نے کہا۔

صبا کھڑی ہو گئی اور بڑے ادب سے بولی۔ "ماموں جان نمائش؛ دکھاوے کے لیے تو نیکی نہیں کرتا۔ کسی سے اچھا سلوک کا نیت سے کرنا چاہیے کہ اس کا اجر خدا دے گا"۔

"شاباش تم نے تو میرا دل جیت لیا۔ نیکی کرنے پر انعام صبا کو ملے گا" ماموں جان بولے۔

"لیکن ماموں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صبا صرف تقریر کر کے انعام جیت لے اور کوئی نیکی نہ کرے؟" چاروں نے ایک ساتھ اعتراض شروع کر دیا۔

ماموں مسکراتے ہوئے بولے "صبا نے صرف تقریر نہیں کی بلکہ وہ عملی طور پر بھی ایسی ہی بچی ہے۔ کل ایک بوڑھا آپ کے گھر کے سامنے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ آپ سب نے اسے وہاں بیٹھے دیکھا لیکن صبا کے سوا کسی نے اس کی مدد نہیں کی"۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

ماموں بولے "آپ کو معلوم ہے کہ میں جس دن آنے کا کہتا ہوں اس دن ضرور آجاتا ہوں۔ مگر کل میں نے سوچا کہ کیوں نہ خود ہی بوڑھے شخص کا روپ دھار لوں تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ آپ میں سے کون کون نیکی کے کام کرتا ہے"۔ یہ کہ کر ماموں نے صبا کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے۔ "صبا بیٹی میں آپ سے بے حد خوش ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح نیکی کے کام کریں گی"۔

"ماموں ہم آئندہ ہر اس شخص کی مدد کریں گے جس کو ہماری مدد کی ضرورت ہو گی"۔ چاروں ایک زبان ہو کر بولے تو ماموں کی خوشی کی انتہا نہ رہی (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

کوئی چڑ نہیں

محمد عمار طاہر، ملتان

"ابے او ٹنڈے" یہ آصف کی آواز تھی جو روز مجھے سننی پڑتی تھی۔ یہی وہ لقب تھا جس سے میں بہت چڑتا تھا۔ لیکن میں چڑنے کے علاوہ کچھ کر نہیں سکتا تھا کیوں کہ وہ شرارتی ہونے کے علاوہ لڑائی بھڑائی میں بھی ماہر تھا اور میں ٹھہرا کم زور۔ لہٰذا میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ حسب معمول اس دن بھی جب میں کلاس میں داخل ہوا تو آصف نے آواز لگائی۔ "ابے او ٹنڈے" میں یہ آواز سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔

"تم مجھے کیوں ہر وقت چڑاتے رہتے ہو۔ میں نے کبھی تمہیں چڑایا ہے" میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

"میں نے کب منع کیا ہے۔ تم بھی میری چڑ بنا لو۔ ویسے

"میری تو کوئی چڑ ہی نہیں"۔

میں یہ سن کر چپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ آصف کی کیا چڑ بنائی جائے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں جی ہی جی میں خوش ہو گیا کہ اگر یہ ترکیب کامیاب ہو گئی تو بہت مزا آئے گا۔ میں آصف کی طرف بڑھا جو اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا اور احمد جو آصف کا دوست تھا، سے مخاطب ہو کر کہا "تمہیں پتا ہے آصف کی تو کوئی چڑ ہی نہیں"

وہ بولا "ہاں یار، مجھے معلوم ہے"

پھر میں نے اسلم سے کہا "تمہیں پتا ہے آصف کی تو کوئی چڑ ہی نہیں"۔

اس طرح میں اس کے ہر دوست سے پوچھتا گیا کہ تمہیں معلوم ہے کہ آصف کی تو کوئی چڑ ہی نہیں۔ ان سب نے کہا "ہاں یار ہمیں پتا ہے کہ آصف کی کوئی چڑ ہی نہیں"۔

آصف یہ سن کر تنگ آ گیا اور بولا "اب بس بھی کرو"

جب دوستوں نے دیکھا کہ یہ جملہ بار بار دہرانے سے آصف چڑ رہا ہے تو احمد نے آصف سے کہا "یار اسے بولنے دو ویسے بھی تمہاری تو کوئی چڑ ہی نہیں"۔

یہ سن کر سارے دوست ہنس پڑے۔ آصف مجھے مارنے کے لیے بھاگا مگر میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اب جو بھی آصف کو دیکھتا وہ کسی بھی قریب والے کو کہتا "تمہیں تو پتا ہے کہ آصف کی کوئی چڑ ہی نہیں"۔ یہ سن کر آصف بہت چڑتا۔

ایک دن چھٹی کے بعد میں اور زاہد گھر جا رہے تھے کہ آصف وہاں سے گزرا۔ میں نے زاہد سے کہا "تمہیں تو پتا ہے کہ آصف کی کوئی چڑ ہی نہیں"۔

یہ سن کر آصف آگ بگولا ہو گیا اور بستہ پھینک کر میری طرف لپکا۔ میں ڈر گیا۔ کیوں کہ وہ ہٹا کٹا تھا اور میں کمزور۔ قریب تھا کہ وہ مجھے ایک دو ہاتھ جڑ دے کہ اسکول کے چوکیدار نے دیکھ لیا۔ وہ ہم دونوں کو پکڑ کر پرنسپل صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا "سر آصف نے مجھے مارا ہے"۔

"سر اس نے میری چڑ بنا رکھی ہے اور ہر وقت مجھے چھیڑتا رہتا ہے" آصف نے کہا۔

پرنسپل صاحب نے کہا "بھئی مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ تمہاری کوئی چڑ ہی نہیں"۔ یہ سننا تھا کہ میں بے اختیار ہنس پڑا۔ بعد میں پرنسپل صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

پچھتاوا

صبا سلیم، خانیوال

"امی اس نوکرانی نے پھر میری چیزوں کو ہاتھ لگایا ہے۔ یہ میری ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھتی ہے"۔ میں نے امی سے نئی نوکرانی کی شکایت کی جو تقریباً میری ہی ہم عمر تھی۔

"ارے بیٹا، یہ بھی تو تمہاری عمر کی ہے۔ غریب ہے۔ ایسی چیزیں اس نے کبھی دیکھی نہیں۔ اس کا بھی دل چاہتا ہے کہ یہ سب اس کے پاس بھی ہوں۔ اسے اس طرح مت دھتکارا کرو، خدا ناراض ہوتا ہے"۔ امی نے مجھے سمجھایا لیکن غصہ میرے قابو میں نہیں تھا۔ خود کو بہلانے کی خاطر میں کمرے میں آئی اور ٹیپ ریکارڈر آن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کیا؟ اس کے بٹن کو کیا ہوا؟ ارے یہ تو لگتا ہے اندر سے کوئی چیز ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں دوڑتی ہوئی امی کے پاس آئی۔ انہیں بتایا۔ امی بھی پریشان ہوئیں۔ کسی نے اس کے بٹن کے ساتھ زبردستی کی تھی اور وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ "یہ ضرور اس کا کام ہے" میں نے نوکرانی پر شک کیا۔

امی نے اسے آواز دی "رضیہ ادھر آؤ"

رضیہ جونہی کمرے میں داخل ہوئی اس کے چہرے کی زردی اور بوکھلاہٹ گواہی دے رہی تھی کہ یہ کام اسی کا ہے "تم نے اس ٹیپ ریکارڈر کو چلانے کی کوشش کی؟" امی نے پوچھا۔

"میں تو..... میں تو..... جی بس صفائی کر رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی لیکن مجھ سے جھوٹ مت بولو" امی نے اسے پیار سے بٹھا کر پوچھا۔

"جی وہ میں دیکھ رہی تھی یہ کیسے چلتا ہے؟" رضیہ آخر مان

گئی۔

"ایسی چیزوں کو آئندہ کبھی ہاتھ مت لگانا۔ یہ بہت قیمتی ہوتی ہیں اور تم ان کے بارے میں نہیں جانتی ہو" امی نے اسے سمجھا کر بھیج دیا۔

امی نے اسے سر پر چڑھا رکھا تھا لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس بار رضیہ کو اس کی حرکت کا مزا چکھانا ہے۔ سو میں اس کے پیچھے پیچھے گئی اور اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ پہلے تو اس نے برداشت کیا لیکن جب میری بڑھتی ہوئی کارروائی دیکھی تو لگی رونے چلانے۔ اس کی آواز سن کر امی دوڑی ہوئی آئیں اور مجھے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئیں اور سمجھانے لگیں۔

رات کو میں سوئی تو خواب میں کیا دیکھتی ہوں کہ میرے امی ابو کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ دنیا سے چلے گئے ہیں۔ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ بھری دنیا میں اب میں دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ صبح بیدار ہوئی تو میں نے اپنے امی ابو کو سلامت پا کر خدا کا شکر ادا کیا لیکن اس خواب نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر اس طرح میرے حالات بدل جائیں اور مجھے بھی دوسروں کے گھر کام کرنا پڑے تو.... لیکن یہ سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے اسی وقت سچے دل سے خدا سے معافی مانگی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہے۔ اب میں نے تہیہ کر لیا کہ رضیہ کو کبھی تنگ نہیں کروں گی (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

نئی امی

مسفرہ فاروق گوندل' چکوال

"یہ جو ثانیہ کی امی ہیں نا..... وہ سوتیلی ہیں اور اسے مارتی ہیں۔ کام بھی کرواتی ہیں۔ کھانا بھی تھوڑا سا دیتی ہیں۔ وہ موٹی سی ہیں نا"۔

"تمہیں کیسے پتا؟ تم نے دیکھی ہیں کیا؟" سحرش نے رابعہ کی بات سن کر کہا۔

"نہیں دیکھی تو نہیں مگر سوتیلی امی جو ہیں۔ سوتیلی امیاں ایسی ہی ہوتی ہیں نا"۔

ابھی وہ مزید باتیں کرنا چاہتی تھیں لیکن پریڈ شروع ہونے کی وجہ سے نہ کر سکیں۔ ثانیہ' سحرش اور رابعہ ہم جماعت تھیں۔ اگلے دن اسلامیات کا ٹسٹ تھا۔ رابعہ کی اسلامیات کی کتاب گم ہو گئی تھی۔ وہ ثانیہ کے گھر گئی تاکہ کتاب لے سکے۔

اس نے دروازہ کھٹ کھٹایا تو ایک چست سی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ "جی ثانیہ ہے" رابعہ نے پوچھا۔

"ہاں گھر میں ہی ہے' اندر آجاؤ"۔ وہ رابعہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ثانیہ کو ساتھ لے کر آئیں۔ "آپ کا نام کیا ہے؟" انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"جی رابعہ"

"اچھا رابعہ آپ ثانیہ سے باتیں کریں۔ میں آپ کے لیے کولڈ ڈرنک لے کر آتی ہوں"۔ یہ کہ کر وہ چلی گئیں۔

"یہ کون ہیں؟" رابعہ نے پوچھا۔

"یہ میری نئی امی ہیں" ثانیہ نے جواب دیا۔

"کیا یہ تمہیں مارتی ہیں؟"

"نہیں تو' یہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔ ہوم ورک بھی کرواتی ہیں۔ کہانی بھی سناتی ہیں"۔

اتنی دیر میں ثانیہ کی نئی امی کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس نے دونوں کو کوک دی۔ رابعہ جب کتاب لے کر واپس جا رہی تھی تو ثانیہ کی امی کے بارے میں صبح کی سوچ پر اسے بہت شرمندگی ہو رہی تھی (پانچواں انعام: 50روپے کی کتابیں)

دل چسپ اور ناقابلِ یقین

عبدالستار خان طاہر

عجیب و غریب گھڑی

1993ء میں امریکا نے ایک ایسی عجیب و غریب گھڑی بنائی ہے۔ جو ملک کی آبادی اور اس میں اضافہ کی رفتار کی شرح بتاتی ہے۔ یہ گھڑی ہر ساڑھے آٹھ سکنڈ پر ایک بچے کی پیدائش کی خبر دیتی ہے۔ ہر 17 سکنڈ پر ایک موت کی اطلاع دیتی ہے۔ اسی طرح گھڑی ہر 90 سکنڈ میں ایک غیر ملکی کی آمد اور ہر 3 منٹ میں ایک شخص کی روانگی کی اطلاع دیتی ہے۔

گدھا الیکشن جیت گیا

یہ 1938ء کی بات ہے کہ امریکا کے شہر واشنگٹن سے ڈیموکریٹک پارٹی کے ایک ممبر نے ری پبلکن پارٹی کی طرف سے امیدوار کے طور پر ایک گدھا کھڑا کیا۔ اس سے صرف وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ووٹر ووٹ دینے کے لیے امیدوار کی قابلیت کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ پارٹی سے وابستگی کو دیکھتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ گدھا 51 ووٹوں سے جیت گیا۔

وقت کا مجسمہ

صدیاں گزریں ملک یونان کے ایک شہر کے درمیان میں ایک عجیب و غریب مجسمہ کھڑا تھا۔ اس عجیب و غریب مجسمے کی شکل و صورت کچھ اس طرح سے تھی: وہ سر سے بالکل گنجا تھا لیکن ماتھے پر بالوں کا ایک گچھا موجود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تیز دھار والی قینچی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے دو لمبے لمبے پر تھے جو اس انداز سے ہوا میں لہراتے ہوئے دکھائی دیتے تھے جیسے مجسمہ اڑ رہا ہو۔

سنگ تراش نے اسے کچھ اس طرح سے بنایا تھا کہ لوگ بے اختیار اس کے متعلق سوچنے لگتے تھے کہ آخر اس کے بنانے کا مقصد کیا ہے؟ وہ پوچھتے کہ اس کے پر کیوں ہیں؟ تو بتانے والا بتاتا کہ یہ ہر وقت اڑتا رہتا ہے۔ لوگ پوچھتے کہ اس کا پورا سر گنجا اور ماتھے پر بال کیوں ہیں؟ تو جواب ملتا کہ اسے جو پکڑنا چاہے صرف اور صرف سامنے سے پکڑ سکتا ہے۔ لوگ پھر سوال اٹھاتے کہ اس کے پاس قینچی کیوں ہے؟ تو آواز آتی "جو اس سے غافل ہوتا ہے تو یہ اس کے بے دردی سے ٹکڑے کر دیتا ہے"۔ پھر آخر میں لوگ حیرت زدہ ہو کر اس کا نام دریافت کرتے تو بتایا جاتا "اس مجسمے کا نام "وقت" ہے۔ جس نے اس کی قدر کی وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اسے ضائع کیا وہ خود ضائع ہو گیا"۔

ایک سال کی غشی

انگلستان کی کنٹربری یونی ورسٹی کا پروفیسر ڈیوڈ گراہم لائیڈ 17 دسمبر 1992ء کے روز غشی میں چلا گیا جسے کاما (COMA) کہتے ہیں۔ وہ پورا ایک سال غشی میں رہا۔ جب

ہوش میں آیا تو وہ بینائی سے محروم ہو چکا تھا اور اس کا جسم ہلنے جلنے سے قاصر تھا۔ اس واقعہ کے ڈیڑھ سال بعد اسی یونیورسٹی کی ایک عورت پولیس کے پاس گئی اور اقبال جرم کیا کہ پروفیسر ڈیوڈ گراہم لائیڈ کو اس نے غشی سے دن پہلے کسی دشمنی کی وجہ سے ہلاک کرنے کے لیے زہر دیا تھا۔

جبڑے ساکت ہو گئے

امریکی ریاست ٹیکساس کے رہنے والے ایک شخص "راف" نے 1948ء میں کسی بات پر ناراض ہو کر اپنی بیوی کو شدید غصے میں برا بھلا کہنے کے لیے پورا زور لگا کر منہ کھولا تو پھر دوبارہ بند نہ کر سکا۔ اس کے جبڑے اس وقت سے اسی حالت میں ہیں کہ اس کا منہ بند نہیں ہوتا۔ اب نہ تو وہ ٹھوس غذا کھا سکتا ہے اور نہ ٹھیک طرح بول سکتا ہے۔ 27 بار آپریشن کروانے کے باوجود اس کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔

بھکاری کی مرغی

چین میں ایک کھانا ایسا کھایا جاتا ہے جس کا تعلق ایک بھکاری کے ساتھ بتایا جاتا ہے اور کھانے کا نام ہے "بھکاری کی مرغی" چینیوں کے ہاں اس کھانے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ اسے بڑے فخر سے غیر ملکیوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس کھانے کی ترکیب ایک بھکاری نے ایجاد کی تھی۔ ہوا یوں کہ اسے مرغی کھانے کا خیال آیا تو اس نے کہیں سے ایک مرغی حاصل کر لی۔ اب اسے پکانے کا مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اسے مرغی پکانے کا پتا نہیں تھا۔ آخر کار اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ اس نے مرغی کو ذبح کر کے اس کے پیٹ میں پیاز اور نمک بھر دیا اور مرغی کے پیٹ کو سی دیا پھر اس پر مٹی کا لیپ کر کے آگ میں ڈال دیا اور قدرت کا تماشا دیکھنے بیٹھ گیا۔ مٹی آگ میں خشک ہو کر پک گئی تو اس نے مرغی کو آگ سے نکال کر زمین پر دے مارا۔ اندر سے پکی پکائی کھانے کے لیے تیار مرغی نکل آئی۔ بھکاری نے اسے مزے لے لے کر کھایا اور کھانے کی یہ ترکیب پورے چین کو دے گیا۔ اب چینی اس کھانے کو "بھکاری کی مرغی" کہہ کر پکاتے ہیں اور بڑے شوق سے کھاتے اور کھلاتے ہیں۔

جڑواں بھائیوں میں حیران کن مماثلت

1979ء میں دو امریکی جڑواں بھائیوں کی عمر بمشکل پانچ ہفتے ہوئی تھی کہ انہیں دو علیحدہ علیحدہ باپوں نے اپنا لیا۔ وہ دونوں 39 سال ایک دوسرے سے دور اور اجنبی رہے۔ ایک دن ایک بھائی کو خیال آیا کہ وہ دوسرے بھائی کو تلاش کرے اور اس سے ملے۔ وہ بلدیہ کے دفتر گیا جہاں یہ اندراج تھا کہ انہیں کن باپوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس طرح دونوں بھائیوں کی ملاقات ہو گئی۔ وہ اکٹھے ہوئے تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ دونوں کے قد ایک جیسے یعنی چھ چھ فٹ کے ہیں۔ دونوں کا وزن بھی ایک جیسا تھا۔ وہ اپنے اپنے بازو بھی ایک ہی طرح موڑتے اور بیٹھنے میں ٹانگیں بھی ایک ہی انداز سے ایک دوسری پر رکھتے۔

یہ سب سے بڑا اتفاق ہے کہ دونوں کا نام بھی ایک ہے۔ دونوں تصویر کشی اور آرٹ میں دلچسپی لیتے ہیں اور ان کی سوچ بھی ایک جیسی ہے۔ ایک بھائی کہتا ہے کہ وہ کوئی بات شروع کرتا ہے تو اس کا دوسرا بھائی اسے ایسے مکمل کر دیتا ہے جیسے اس کے بھائی کو علم ہو کہ اس کے دل میں کیا تھا۔

ایک دوست: "بحری جہاز کے سفر کے دوران میں تین آدمی سمندر میں گر پڑے مگر ان میں سے صرف ایک کے بال گیلے ہوئے"

دوسرا دوست: (حیران ہوتے ہوئے): "یہ کیسے ممکن ہے؟"

پہلا دوست: "اس لیے کہ باقی دو گنجے تھے"۔

(علی احسان لاہور)

ایک صاحب (مصور سے): اچھا تو آپ وہ مشہور مصور ہیں جنہیں جانوروں کی تصویریں بنانے میں کمال حاصل ہے۔

مصور: جی ہاں! کیا آپ کا بھی تصویر بنوانے کا ارادہ ہے

(عنصر علی شرق پور)

ایک ملزم سے، جس نے قتل کیا تھا، جج نے پوچھا "کیا تم نے مقتول کو قتل کیا ہے؟"

ملزم: جی نہیں

جج (ہوشیاری سے): مگر مقتول کا بیان ہے کہ تم نے اسے چھ گولیاں ماری تھیں۔

ملزم: (جلدی سے) یہ جھوٹ ہے۔ میں نے اس کو تین گولیاں ماری تھیں

(محمد عمران فاروق جنڈانوالہ)

استاد (شاگرد سے): بتاؤ تمہارے اسکول کے نام کے ساتھ ہائی اسکول کیوں لکھا جاتا ہے؟

شاگرد: اس لیے کہ یہ چوتھی منزل پر واقع ہے

(عبدالوحید بھٹہ ملتان)

ایک شخص نے اپنے کنجوس دوست سے پوچھا: "کیا بات ہے' اداس کیوں ہو؟"

دوسرا دوست: "پریشانی کی ہی تو بات ہے' پہلے گھی 50 روپے فی کلو تھا' اب 40 روپے فی کلو ہو گیا ہے"۔

پہلا دوست (حیرت سے): "تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کیوں کہ اب تمہارے 10 روپے بچیں گے"۔

"یہی تو دکھ ہے"۔ کنجوس شخص افسوس ناک انداز میں بولا "پہلے میں گھی نہ خرید کر 50 روپے بچاتا تھا' اب صرف 40 روپے بچیں گے"

(ساجد علی تبسم بہاول پور)

ایک دفعہ ایک چور کسی باغ میں گیا اور پھلوں سے اپنے کوٹ کی جیبیں بھرنے لگا۔ اتنے میں مالک وہاں آنکلا اور چور کو پکڑ کر بولا "تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

چور نے جواب دیا "جناب میں بے قصور ہوں۔ مجھے تو ایک طوفان نے یہاں پھینک دیا ہے"۔

مالک نے کہا "مگر تم نے پھل کیوں توڑے؟"

چور بولا "پھل تو طوفان کی وجہ سے گر گئے"۔

مالک نے پوچھا "لیکن یہ پھل تمہاری جیبوں میں کیسے آگئے؟"

چور نے فوراً کہا "جناب میں خود اس بات پر حیران ہو رہا ہوں"

(سعد انعام راول پنڈی)

ایک لڑکا امتحان میں فیل ہو گیا اس نے اپنی بہن کو خط لکھا "میں دوبارہ فیل ہو گیا ہوں۔ ابو کو تیار کر لو"۔

بہن نے جوابی خط بھیجا "ابو تیار ہیں تم تیار ہو کر آنا"۔

(سحرش خان حویلیاں)

ماں: بیٹی' آپ آنکھیں بند کر کے آئینے کے پاس کیا کر رہی ہیں؟

بیٹی (معصومیت سے): یہ دیکھ رہی ہوں کہ سوتے ہوئے میں کیسی لگتی ہوں؟

(محمد ابوبکر ڈھولن چک نمبر 7)

میراتھان ریس

میراتھان یونان میں پانچ میل لمبا اور دو میل چوڑا میدان ہے۔ اس کے ایک طرف سمندر ہے اور باقی تین پہلوؤں کو پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ 490 قبل مسیح کے موسم بہار میں اسی مقام پر آتش پرست ایرانیوں اور یونانیوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں ایرانیوں نے تعداد میں چھ گنا ہونے کے باوجود شکست کھائی۔

ایران کا شہنشاہ دارا گشتاشپ ایشیا میں اپنی فتوحات کا لوہا منوا چکا تھا۔ اب اس نے یونان کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا اپنے ایک سپہ سالار کو چھ سو جہازوں کا بیڑا' چالیس ہزار سے ساٹھ ہزار تک سوار اور بے شمار پیادہ فوج دے کر یونان بھیجا۔ ایرانی فوج کے جہاز میراتھان کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے۔ پھر دارا گشتاشپ کی اس فوج اور یونانی فوج کا آمنا سامنا ہوا۔

یونانی فوج دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اس فوج کا سپہ سالار ملیاڈیز تھا۔ اس نے لڑائی کا جو منصوبہ تیار کیا اس سے بعد میں بڑے بڑے سپہ سالار کام لیتے رہے۔ یونانیوں کے پاس بڑی بڑی ڈھالیں اور لمبے لمبے نیزے تھے۔ ملیاڈیز نے دائیں اور بائیں بازو کو خوب مضبوط کر لیا اور قلب یعنی درمیان کو کمزور رکھا۔ یونانی فوج کے سپہ سالار نے اس انداز میں اپنی فوج کی صف بندی کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اب ایرانیوں پر ہلہ بول دینا چاہیے۔

لڑائی شروع ہوئی تو ایرانیوں نے یونانی قلب یعنی درمیان ہی پر حملہ کیا۔ یونانی فوج کا جب یہ دستہ پیچھے ہٹا تو ایرانی آگے بڑھے۔ اس طرح وہ خود ہی ان کے درمیان میں آگئے۔ اسی دوران میں یونانی فوج کے بازوؤں نے یعنی دائیں بائیں جانب کے دستوں نے ایرانی فوج کو پوری طرح گھیرے میں لے لیا اور درمیان میں بھینچ کر قتل عام شروع کر دیا۔ اس لڑائی میں چھ ہزار چار سو ایرانی مارے گئے' باقی جہازوں پر سوار ہو کر بھاگ گئے۔ ایک چھوٹے سے ملک کا بہت بڑی سلطنت کے مقابلے میں یوں کامیابی حاصل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا واقعہ ہے' لیکن اس کے علاوہ بھی میراتھان کے ساتھ ایک ولولہ انگیز یاد وابستہ ہے۔

یہ دل چسپ واقعہ کچھ یوں ہے کہ میراتھان کے میدان میں یونانیوں کی فتح کے بعد ایک یونانی فوجی شہر ایتھنز کے لوگوں کو فتح کی خبر سنانے کے لیے میراتھان کے میدان سے ایتھنز کی طرف دوڑا۔ یہ فوجی کسی مقام پر رکے بغیر ایتھنز شہر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ وہ لڑائی میں حصہ لینے کے باعث تھکاوٹ سے چور ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے چوبیس میل کا پہاڑی راستہ دوڑ کر طے کیا اور جا کر اہل وطن کو پیغام دیا:

"ہم نے اپنے سے کئی گنا بڑی فوج کو شکست دے دی ہے۔ ہم بہترین تربیت یافتہ اور بے حد دلیر سپاہی ہیں۔ جشن مناؤ' ہمیں فتح حاصل ہوئی ہے"۔

پھر تھکا ماندہ یونانی فوجی یہ کہہ کر تھکاوٹ سے نڈھال ہو کر گرا اور مر گیا۔ یونانیوں نے اولمپک کھیلوں میں اس بہادر یونانی فوجی کی دوڑ کو بھی شامل کر لیا۔ جب بھی ان کھیلوں کا انتظام ہوتا تو چوبیس میل لمبی دوڑ کا مقابلہ بھی ہوتا' جسے "میراتھان کی دوڑ" کہا جاتا۔ 1896ء میں اولمپک کھیل جب نئے سرے سے شروع ہوئے تو ان کھیلوں کے مقابلوں میں میراتھان دوڑ کا مقابلہ بھی شامل تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس دوڑ میں بھی ایک یونانی فوجی ہی اول رہا۔ میراتھان ریس اب بھی اولمپک کھیلوں کا اہم اور دل چسپ مقابلہ ہے۔

(ڈاکٹر رضوان ثاقب)

حامد مشہود

زردرو خان

ہر بات تو خدا ہی جانتا ہے مگر بڑوں سے سنا ہے کہ چین کے قریبی ملک منگولیا میں آج سے ہزاروں سال پہلے ایک ظالم حکمران حکومت کیا کرتا تھا جس کا نام تھا زردرو خاں۔ کہتے ہیں کہ ہلاکو خاں اور چنگیز خاں وغیرہ بھی اسی کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ جب پیدا ہوا تو اس کا جسم خاصا زرد تھا' اس لیے اس کا نام زردرو خاں رکھا گیا۔ بعد میں اس کی ہر پسند بھی زرد رنگ سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ زرد رنگ کے کپڑے پہننا پسند کرتا تھا۔ اس کے بستر کی چادر زرد تھی۔ تخت بھی زرد رنگ کا بنوا رکھا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کے محل میں ہر شخص زرد رنگ کے کپڑے پہنے گا خواہ وہ وزیر' درباری یا اس کا عام ملازم ہو۔ محل کے زنان خانے میں جہاں شاہی خاندان کی عورتیں رہتی تھیں' ہر کنیز یعنی خادمہ زرد رنگ کے کپڑے پہنے رہتی تھی۔

کھڑکیوں پر زرد رنگ کے پردے تنے رہتے تھے۔ ہر کمرے کا قالین بھی زرد ہوتا تھا۔ اور تو اور پورے محل میں موجود ہر برتن اور مکھیاں اڑانے والا ہر مور چھل بھی زرد ہوتا تھا۔ محل پر زمین سے لے کر بلند مینار تک زرد رنگ کیا گیا تھا۔ اس محل میں چار مالی تھے اور ان چاروں کا سارا سال ایک ہی کام تھا' ایسے پودے اور بیلیں لگانا جن پر زرد پھول اور پیلی کلیاں کھلیں۔

زردرو خاں کے محل میں ایک لڑکی کام کرتی تھی جس کا نام تھا گل۔ وہ جب پیدا ہوئی تو اس پر کسی پھول کا سا شک ہوتا تھا۔ اس کا جسم خوب صورت اور نرم و نازک تھا۔ دیکھنے والا تو بس اسے دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ اس کی والدہ اور اس کا والد دونوں محل میں کام کرتے تھے۔ والدہ کنیز یعنی ملازمہ تھی اور والد محل کا ایک عام سا مالی۔ اس کے والد نے سوچ بچار کر کے اس کا نام گل رکھا یعنی پھول۔

گل نے بچپن کھیل کود کر گزارا اور جب ذرا بڑی ہوئی تو اپنی والدہ کے ساتھ محل میں کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایک روز تھال میں شیشے کے پیالے رکھ کر بادشاہ اور اس کے مہمانوں کو شربت پلانے جا رہی تھی کہ اس نے دونوں ہاتھوں کو حرکت دی اور پیالے آپس میں ٹکرائے۔ بادشاہ کو یہ آواز بہت پسند آئی اور اس نے حکم دیا کہ گل ہی ہمیشہ بادشاہ اور اس کے مہمانوں کو شربت پلایا کرے گی۔

گل روزانہ یوں ہی تھال میں شیشے کے پیالے رکھ کر انہیں بجاتی آتی اور آ کر بادشاہ کو شربت پلاتی۔ بادشاہ اس لڑکی کو گل کہنے کے بجائے گل رباب کہہ کر بلاتا۔ رباب ایک آلہ ہوتا ہے جسے بجایا جاتا ہے اور اس میں سے دل کش آوازیں نکلتی ہیں۔

یوں آہستہ آہستہ اس لڑکی کا نام گل رباب مشہور ہو گیا۔

زردرو خاں ایک ظالم بادشاہ تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کی موت کا حکم جاری کر دیتا۔ کسی کو معاف کر دینا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے دربار میں لمبا تڑنگا سیاہ فام جلاد شیر کی کھال اوڑھے بھاری بھر کم کلہاڑا لیے ہر وقت تیار بیٹھا رہتا تھا کہ کب بادشاہ کا اشارہ ہو اور وہ اپنا فرض انجام دے۔

زردرو خاں شکار کرنے کا بہت شوقین تھا۔ وہ اکثر گھوڑے کتے اور عقاب وغیرہ اپنے ساتھ لے کر شکار کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ دوڑتے جانور پر کمند یعنی رسہ ڈالنے کے ماہر افراد بھی ہوتے۔ کبھی کبھار اس کے ساتھی جال لگا کر بھی شکار کرتے۔

ایک روز وہ شکار کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا۔ شام کے وقت گل رباب محل کے باغ سے پیلے پھول توڑ کر لائی اور ان کے گل دستے بنا بنا کر بادشاہ کے پیلے پلنگ پر سجانے لگی۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ شام ہوتے ہی پیلے پھولوں کے گل دستے بادشاہ کے پلنگ کی ٹیک پر سجا دیا کرتی تھی۔ اگرچہ ان پھولوں میں خوش بو نام کی کوئی چیز نہیں تھی مگر یہ پھول زردرو خاں کی پسند تھے۔

اس شام گل رباب نے آہستہ سے اس پلنگ کو دیکھا تو نرم و نازک گدا اور اس پر بچھی مخمل کی زرد چادر اسے بہت بھلی لگی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر اس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ بادشاہ ہمیشہ رات گئے شکار کھیل کر واپس آتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ پلنگ پر لیٹ گئی کہ میں بھی زندگی میں ایک بار اس نرم بستر کا مزا لے لوں۔ وہ دن بھر کے کام کاج سے تھکی ہوئی تھی، لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور تب کھلی جب زردرو خاں گالیاں بکتے ہوئے اس پر شڑاپ شڑاپ کوڑے برسا رہا تھا۔ اس نے بے چاری کنیز کی کوئی التجا نہ سنی اور چیخ کر اپنے ملازم کو بلایا۔ فوراً ایک ہٹا کٹا ملازم مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آیا اور اس نے اسے آ کر دبوچ لیا۔ پھر بادشاہ کے حکم پر اسے دھکیلتا ہوا قید خانے میں لے گیا۔

قید خانے کے نگران نے اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ قید خانہ صبح صبح کھول دیا جاتا تھا اور تمام قیدیوں کو ناشتا دے کر مختلف کاموں پر لگا دیا جاتا تھا۔ شام کے وقت انہیں کھانا دے کر دوبارہ کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ ناقص خوراک اور مسلسل کام کی وجہ سے زیادہ تر قیدی بیمار پڑ چکے تھے۔ اس سلسلے میں بادشاہ کا حکم تھا کہ جو قیدی بالکل کام کرنے کے قابل نہ رہے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اس لیے بیمار اور کم زور قیدی بھی زندگی بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلاتے رہتے تھے۔

ان قیدیوں میں ایک خوب صورت جسم کا مالک اور مضبوط جوان لڑکا بھی شامل تھا۔ جس کے چہرے پر موجود لالی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ اسے قید ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے ہیں۔ ورنہ پرانے قیدیوں کے چہروں پر تو وحشت برستی تھی۔ اس نے کام کرتے کرتے گل رباب کو بتایا "میں منگولیا کے ایک شہر کا راجا ہوں۔ میرے والد صاحب پچھلے برس فوت ہو گئے تھے۔ لہٰذا مجھے کم عمری میں راجا بن کر شہر بھر کا انتظام سنبھالنا پڑا۔ پچھلے ماہ بادشاہ ہمارے شہر آیا اور میری حویلی میں ٹھہرا۔ میں نے ہمت کے مطابق اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ اچانک شام کے وقت حویلی کے جھروکے میں سے بادشاہ نے میری بہن کو میدان میں گھڑ سواری کرتے دیکھ لیا اور مجھے اسی وقت حکم دیا کہ "ہم اس لڑکی کو ملکہ بنائیں گے۔ تجھے تیاری کے لیے پانچ روز دیے جاتے ہیں"۔

میں یہ سن کر بہت گھبرایا۔ کیوں کہ میں اس ظالم شخص سے اپنی بہن کی شادی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی کہ بادشاہ سلامت آپ شاہ ہیں اور ہم صرف چھوٹے سے راجا۔ مگر اس کم بخت کو نہ ماننا تھا نہ مانا۔

میں نے تیسرے روز خود بادشاہ کے محل پر حاضری دی اور اس سے درخواست کی کہ وہ ہمارے حال پہ رحم کھائے۔ مگر اس نے غصے میں آ کر فوراً فوج بھیج کر میری بہن لیلیٰ کو زبردستی بلا لیا اور اسے کہا کہ وہ فوراً اسی وقت شادی کے لیے تیار ہو جائے۔ لیلیٰ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اسے محل کے تہ خانے میں بند کروا دیا اور مجھے اس قید خانے میں ڈلوا دیا"۔

پھر اس راجا نے گل رباب سے کہا۔ "میری رہائی کی بس ایک ہی صورت ہے کہ میں لیلیٰ کو شادی پر راضی کروں۔ کیوں کہ لیلیٰ سے شادی کرنا اس ظالم بادشاہ کی صرف ایک ضد بن گئی ہے"۔

"مگر بادشاہ کی تو پہلے ہی ایک ملکہ موجود ہے"۔ گل رباب نے سوچ کر کہا۔ اسے اس نوجوان کا قصہ غم سن کر دلی افسوس ہوا تھا۔ "بادشاہ کا یہ فیصلہ سمجھ میں نہیں آتا؟"

"ظالم جو ہوا" راجا نے کہا "میرا نام دعان ہے، راجا دعان اور

تمہارا کیا نام ہے؟ اچھی لڑکی!"

"میرا نام تو گل ہے مگر اب مجھے گل رباب کہتے ہیں"۔

"گل رباب، تم مجھے رہائی دلا سکتی ہو" راجا دعان نے ادھر

ادھر دیکھ کر سرگوشی کی۔

"میں؟ مگر کیسے؟" گل رباب حیران ہو گئی۔

"چوکی دار کو دھوکا دے کر" راجا دعان نے پھر آہستگی سے

"دھوکا! توبہ! توبہ! دھوکا دینا تو بہت بری بات ہے" گل

رباب نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں کو لگا کر کہا۔

"ہاں دھوکا دینا بہت بری بات ہے مگر میں یہ تو نہیں کہہ رہا

کہ کسی کو دھوکا دے کر کپڑا یا برتن فروخت کرو۔ اگر تم مجھے رہائی

دلانے میں میری مدد کرو گی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ باہر نکل کر

اس ظالم بادشاہ کے خلاف جہاد کروں گا۔ اور یوں تمہاری وجہ سے

دنیا کے لاکھوں مظلوم عوام ایک ظالم حکم ران سے نجات پا

جائیں گے۔ کیا تمہیں انسانوں سے محبت نہیں ہے؟"

"مجھے انسانوں سے بہت محبت ہے۔ میں خدا کے بعد

انسانوں سے ہی محبت کرتی ہوں" گل رباب نے دل پر ہاتھ رکھ کر

اور پھر وہ دونوں بادشاہ کے ہرکاروں کی طرف سے دیا گیا

کرتے ہوئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ آخر کار ان

دونوں کا ایک ترکیب پر اتفاق ہو گیا۔ شام کے وقت چوکی داروں

نے انہیں بند کر دیا اور پھر دوسرا چوکی دار آ گیا۔ اس نے ساری رات

ڈیوٹی کرنا تھی۔ چوکی دار کیا تھا بس پلا پلایا بھینسا تھا۔ اس نے پہلے

چوکی داروں کے جاتے ہی مزے سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور

جیب میں سے پھل نکال نکال کر کھانے لگا۔ پیٹ پوجا سے فارغ

ہو کر وہ لمبے لمبے ڈکار لیتا ہوا دھیرے دھیرے قید خانے میں ٹہلنے

لگا۔ گل رباب اپنی کوٹھری کی سلاخوں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

جب وہ قریب آیا تو اس نے بڑے ملائم لہجے میں اسے آواز دی "بات

سنو"

وہ ذرا بھر متوجہ ہوا تو بولی۔ "آپ بہت اچھے ہیں"۔

"ہیں؟ ہاں ہاں وہ تو میں ہوں ہی" اس نے بڑا سا منہ کھول

لیا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ مجھے تمام چوکی داروں میں سے

اچھے لگتے ہیں"۔

"اچھا؟" وہ دھڑام سے وہیں نیچے بیٹھ گیا اور جیب سے ایک

پھل نکال کر گل رباب کی طرف بڑھایا۔

"یہ باقی چوکی دار تو عام سے ہیں اور آپ بہت طاقت ور

ہیں۔ آپ جیسے جوان مرد کو تو فوج کا سردار ہونا چاہیے"۔

"ہاں ایک بار ادھر ایک گیدڑ رات کے وقت گھومتا گھماتا

نکل آیا تھا۔ میں نے ایک ڈنڈا مار کر وہیں ڈھیر کر دیا تھا" اس نے ایک

من گھڑت واقعہ سنایا۔

"بہت خوب" گل رباب نے تالی بجا کر کہا "گیدڑ کو تن تنہا

مار دینا واقعی طاقت وروں اور بہادروں کا کام ہے"۔

"تو اور کیا" اس چوکی دار نے پھر حماقت سے بھاڑ سا منہ

کھول لیا۔

"جب میں چھوٹ جاؤں گی، اس قید سے، تو ملکہ عالیہ کو کہہ

کر آپ کو فوج کا ایک بڑا سردار بنوا دوں گی" گل رباب نے پھل

کھاتے ہوئے کہا۔

"ہو ہو ہو" وہ خوف ناک انداز میں ہنس دیا "بھلا اب کہاں

رہائی پاؤ گی اور اگر رہا ہو بھی گئی تو دوبارہ محل میں نہیں جا سکو گی"۔

"نہیں، کل دربار کا ایک آدمی آیا تھا۔ وہ بڑے چوکی دار

کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ اگلے ہفتے نئے سال کی خوشی کا جشن ہو

رہا ہے۔ بادشاہ سلامت مجھے اس روز آزاد کر دیں گے تاکہ میں

انہیں پیالے بجا بجا کر مشروب پلاؤں"

"مگر تیری بات ملکہ عالیہ کیسے مان جائیں گی؟ تو محض ایک

کنیز ہے اور...."

"مجھے بادشاہ سلامت رباب کہتے ہیں۔ کیوں کہ میں تھال

میں رکھے پیالوں کو ایک ہی سر میں بجاتی چلی آتی ہوں۔ ملکہ عالیہ

کے سر میں روزانہ زیتون کے تیل کی مالش کرتی ہوں۔ وہ مجھ سے

بہت پیار کرتی ہیں۔ وہ تو بادشاہ سلامت ذرا ناراض ہو گئے تھے۔ پتا

درباری بتا رہا تھا کہ میرے بعد کئی کنیزوں نے پیالے تھال میں رکھ

کر بجانے کی کوشش کی مگر نہ تو اچھی آواز نکلی اور نہ بادشاہ سلامت خوش ہوئے بلکہ دو کنیزوں نے تو پیالے ہی توڑ ڈالے۔ میں نہ صرف ملکہ عالیہ سے کہ کر آپ کو فوج کا سردار بنوادوں گی بلکہ میں اس کے علاوہ بھی آپ کے بہت کام آؤں گی"۔

"مثلاً کیا؟" چوکی دار نے تیزی سے پوچھا۔

"اوں...." گل رباب نے آنکھیں میچ کر ایک ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر کچھ دیر سوچا اور پھر چونک گئی "آپ کی عمر کتنی ہے؟"

"یہی کوئی چالیس سال" چوکی دار نے اسے چاند کی روشنی میں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور آپ کے بیوی بچے؟"

"ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں کھاتا سوتا اور موٹا بہت زیادہ ہوں" اس بے چارے نے افسردگی سے کہا۔

"میں آپ سے شادی کرلوں گی" گل رباب نے آہستہ سے کہا۔

"سچ مچ؟ میں اپنی شادی پر ڈھیر سارا گوشت پکاؤں گا"۔

وہ فوراً بولی "اور سارا خود کھا جاؤں گا"

"ہو ہو ہو" وہ زور زور سے ہنسا۔ اسی وقت ساتھ والی بڑی کوٹھری سے راجا دعان نے تکلیف سے کراہ کر پانی مانگا۔

"یہ بے چارہ نہ جانے کون ہے' آپ اسے پانی پلادیں ناں" گل رباب نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

"چھوڑو اسے.... ہاں تو میں دلہا بن کر اونٹ پر بیٹھ کر آؤں گا" چوکی دار نے شادی کے منصوبے طے کرنا شروع کر دیئے۔ عین اسی وقت راجا دعان نے پھر زور سے "پانی پانی" کہا۔

"آپ بے شک ہاتھی پر بیٹھ کر آیئے گا مگر اس غریب کو ذرا پانی تو پلادیں"۔

"اس بڑی کوٹھری کی سلاخیں بہت تنگ ہیں۔ ان میں سے پیالہ نہیں گزر سکتا"۔ اس نے بے زاری سے وجہ بیان کی "اچھا جب میری شادی...."

گل رباب نے اس کی بات کاٹ دی "بھئی دروازہ کھول کر پلادیں"۔

"توبہ' توبہ!!!!" وہ چونک کر بولا "بادشاہ سلامت کا سخت حکم ہے کہ رات کے وقت کسی صورت میں دروازہ نہ کھولا جائے خواہ کوئی مر کیوں ہی نہ جائے.... ہاں تو میں اپنی شادی پر گھوڑے کا گوشت پکوا کر...."

"دروازہ کھول کر اسے پانی پلادیں۔ آپ گھبرا کیوں رہے ہیں۔ باہر فوجی بھی تو موجود ہیں" گل رباب نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ چاروں اس وقت سو گئے ہوں گے۔ بڑے کام چور ہیں۔ میں اندر رات کے وقت اکیلا ہوتا ہوں اس لیے دروازہ تو نہیں کھول سکتا.... میں شادی کے روز سرخ جوڑا پہنوں گا۔ میں تنگ آگیا ہوں یہ زرد کپڑے پہن پہن کر"

راجا نے پھر کراہ کر پانی مانگا۔ وہ غریب نہ جانے کتنا دکھ کاٹ رہا تھا اور اس چوکی دار نے بارات کی تیاری شروع کی ہوئی تھی۔

"اس کوٹھری میں صرف پانچ افراد بند ہیں۔ آپ جیسے طاقت ور جوان کے آگے وہ تو دم بھی نہیں مار سکتے۔ اسے پانی پلا دیں ورنہ وہ مر جائے گا"۔ اس نے پھر چوکی دار کی خوشامد کی۔

"اسے مرنے دو' یہی بادشاہ کا حکم ہے۔ میں مجبور ہوں"۔

"وہ زندہ رہا تو ساری عمر آپ کو دعائیں دے گا"

"ہو ہو ہو" وہ زور سے ہنسا "میری ماں نے میری صحت کے لیے دعا کی تھی اور اب صحت کا یہ عالم ہے کہ"۔

"چلو ٹھیک ہے' میں آپ سے نہیں بولوں گی" اس نے منہ بسور لیا۔

تب موٹا تازہ چوکی دار نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھا اور پانی کا پیالہ گھڑے میں سے بھر لایا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سامنے راجا دعان فرش پر پڑا کراہ رہا تھا اور پانی مانگ رہا تھا۔ چوکی دار اس کے پاس بیٹھ کر اسے پانی پلا کر واپس مڑنے کے لیے کھڑا ہوا ہی تھا کہ اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ راجا نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس نے اس کی تلوار میان میں سے نکال کر الٹی تلوار کا ایسا ہاتھ اس کے سر پر جمایا کہ وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر راجا نے اس کی جیبوں سے چابیاں نکال کر قید خانے کے سارے دروازے کھول دیئے۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ واقعی چاروں فوجی بڑے پھاٹک کے
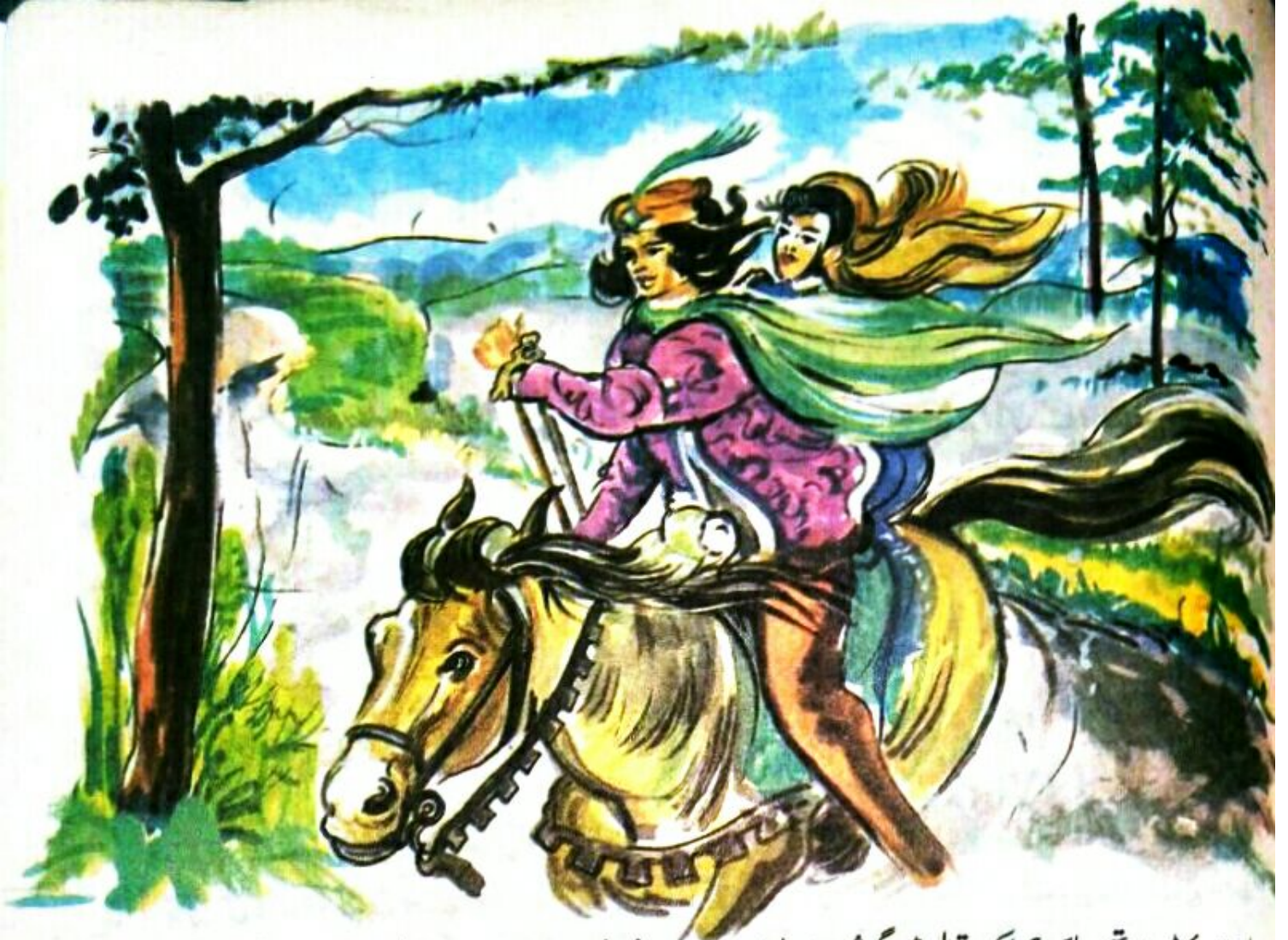
باہر سوئے پڑے تھے۔ پاس ہی ایک تھال میں گوشت اور ہڈیاں پڑی تھیں اور دو کتے بیٹھے مزے اڑا رہے تھے۔

اگرچہ وہ پورے بے خبر تھے مگر پھر بھی راجادعان نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے بے ہوش چوکی دار کو اچھی طرح باندھ کر اس کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا اور اس کوٹھری کو تالا لگا دیا۔ پھر اس نے تمام قیدیوں کو باری باری قید خانے کی پچھلی دیوار سے باہر نکالا۔ دیوار ذرا اونچی تھی اس لیے کم زور قیدی رسے کا سہارا لے کر اتر گئے۔

اس قید خانے کے عین پچھواڑے میں بادشاہ کا اصطبل تھا۔ راجادعان اس میں سے ایک ترکی گھوڑا نکال لایا اور گل رباب کو ساتھ بٹھا کر اپنے شہر کی طرف اڑن چھو ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس قدر خاموشی اور احتیاط سے ہونے والا فرار صبح تک چھپا رہے گا۔ صبح تک اس نے بھی کوسوں دور نکل جانا تھا۔ برق رفتار گھوڑا منزلوں پہ منزلیں مارتا جا رہا تھا۔

اس کے بعد ان دونوں کی زندگیوں کا ایک ہی مقصد تھا۔ عوام کو بادشاہ کے ظلم کے خلاف تیار کرنا۔ راجادن رات سفر کر کے شہر شہر جاتا اور سب سے پہلے اس شہر کے راجا سے ملتا پھر ڈھول بجا بجا کر سارے شہر کے لوگوں کو جمع کیا جاتا اور پھر راجادعان انہیں ظالم بادشاہ کے خلاف جہاد کرنے پر مائل کرتا۔ گل رباب بھی ہر سفر میں اس کے ساتھ ہوتی۔ وہ تھال میں شیشے کے پیالے رکھ کر انہیں بجاتی ہوئی آتی اور میدان کے چبوترے پر چڑھ کر لوگوں کو ظلم کی وہ داستانیں سناتی جو وہ اپنی آنکھوں سے محل میں دیکھ چکی تھی۔

چند روز بعد زرد رو خاں نے راجادعان کی حویلی پر دھاوا بول دیا۔ اتفاق کی بات کہ راجا اس وقت دیہی علاقوں میں لوگوں کو جنگ کے لیے تیار کرنے گیا ہوا تھا۔ گل رباب بخار کی وجہ سے حویلی میں ہی موجود تھی۔ نازک جان کو مسلسل سفروں نے مسل کر رکھ دیا تھا۔ زرد رو خاں اسے وہاں دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور اپنے چابک سے مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ ڈالی۔ پھر گھوڑے پر اسے باندھ کر ساتھ لے گیا۔ اس نے اس کی گردن تن سے جدا کروا دی اور اسے باغ میں دبا دینے کا حکم دیا۔

کہتے ہیں کہ اس رات بڑے زوروں کی بارش ہوئی۔ ایسا لگتا

تھا کہ آسمان بھی انسان دوست لڑکی کے قتل پر زار و قطار رو پڑا تھا۔ بادل اسے جھک جھک کر دیکھنے آئے تھے۔ دوسرے روز شام کے وقت باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے بادشاہ نے گل رباب کے والد کو بلایا اور حکم دیا "گل رباب کی قبر پر زرد پھولوں کے پودے لگاؤ"

اس بے بس مالی نے اپنے آنسو روک روک کر اسی وقت زرد پھولوں کے پودے کی قلمیں کاٹ کر گیلی مٹی میں گاڑ دیں' جہاں اس کی وہ عزیز بیٹی دفن تھی جس کے دل میں گوشت اور خون سے زیادہ انسانوں کی محبت تھی۔

چند روز بعد ان قلموں پر نئے شگوفے پھوٹے اور نرم نرم پتیاں نکل آئیں۔ پھر ایک ہفتے کے اندر اندر وہاں تناور پودے عجب بہار دکھلا رہے تھے۔ شاید گل رباب کا خون انہیں غذا مہیا کر کے بڑا کر رہا تھا۔

بعد میں عوام نے راجا دعان کے ساتھ مل کر عام بغاوت کر دی اور شاہی محل کا دروازہ توڑتے ہوئے ہجوم اندر آگیا۔ راجا دعان نے بادشاہ کو توبہ کرنے کی مہلت دی مگر اس نے توبہ یوں کی کہ تلوار نکال کر راجا پر ہی حملہ کر دیا۔ رعایا سے اور صبر نہ ہو سکا۔ لوگوں نے آگے بڑھ کر مار مار کر اس کا کچومر ہی نکال دیا۔ اس کی لاش کو دریا میں پھینک دیا۔ راجا دعان ساتویں تہ خانے سے اپنی بہن لیلیٰ کو نکال کر ساتھ لے گیا۔ جو ہڈیوں کا ایک پنجر بن چکی تھی۔ رعایا نے مل کر شاہی خاندان کے ایک اور نرم دل' سمجھ دار اور عقل مند بزرگ کوہ جگر خاں کو بطور بادشاہ چن لیا۔

کوہ جگر خاں نے عام اعلان کیا کہ وہ ہر سال اچھے کام کرنے والے لوگوں میں محل کے باغ میں کھلنے والے سرخ خوش بو دار پھولوں کے پودوں کی قلمیں تقسیم کیا کرے گا۔ لوگوں نے سرخ خوش بو دار پھول پسند کیے۔ کوہ جگر خاں نیک نام لوگوں میں ہر سال ان پھولوں کی قلمیں تقسیم کرتا رہا۔ یوں ان خوب صورت پھولوں کی نسل بڑھتی چلی گئی۔ لوگ ان پھولوں کو گل رباب کہتے تھے یعنی رباب کے پھول۔ آخر کثرت استعمال سے یہ لفظ "گلاب" بن گیا۔

یہ گلاب کی ابتدائی شکل تھی بعد ازاں اس کی کئی قسمیں بن گئیں اور ہلکے تیز رنگوں والے گلاب بھی رواج پا گئے۔ سرخ گلاب آج بھی انسان دوستی کی زندہ مثال ہے۔ یہ پسندیدگی کی علامت ہے۔ اس کی مہک ہمیں آج بھی "قربانی" کی یاد دلاتی ہے۔ جو گل رباب نے تمام انسانوں کے لیے دی تھی۔

منگولیا MONGOLIA

چین اور روس کے درمیان واقع کم آبادی والا یہ ملک کسی زمانے میں ایک بہت بڑی سلطنت کا صدر مقام تھا۔ 13ویں صدی عیسوی یہ عظیم سلطنت تھی جو ہنگری سے کوریا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا سربراہ چنگیز خان تھا۔ 16ویں صدی عیسوی میں اس سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ 1644ء سے 1911ء تک منگولیا چین کے قبضے میں رہا۔ 1919ء میں چین نے دوبارہ اس پر قبضہ کیا لیکن وہ قبضہ قائم نہ رکھ سکے۔ 1921ء میں ان کو منگولیا چھوڑنا پڑا۔ 1924ء میں یہ روسیوں کے قبضے میں آگیا۔ منگولیا میں کلموک' بوریات اور خالکھا زبانیں بولی جاتی ہیں۔

منگولیا قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ یہاں صحرائے گوبی کے اونچے اونچے ریتلے ٹیلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بدوؤں کی مناجاتیں بھی اونچی اونچی آواز میں سننے کو ملتی ہیں۔ لوگوں کا عام پیشہ زراعت اور گلہ بانی ہے۔ گھوڑے اور بھیڑ بکریاں پالنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ زیادہ آبادی والا حصہ درمیان میں واقع ہے۔ جو سبزہ زار وادیوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے یہاں کے چرواہے اپنی بھیڑ بکریوں کی خوراک کے لیے نئی نئی چراگاہیں ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ یہاں کے موسمی حالات بہت سخت ہیں۔ گرمیوں کا موسم بہت مختصر ہوتا ہے۔ موسم سرما بہت طویل اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔ مغرب سے شمال کی طرف تمام ملک پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے جب کہ جنوب کی سرحدیں صحرائے گوبی سے ملتی ہیں۔

ایم ایم عالم

6 ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ ہماری قومی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ بھارت نے رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح اچانک حملہ کر کے جس بزدلی کا مظاہرہ کیا وہ اپنی جگہ نہایت شرم ناک حرکت تھی' تاہم پاک فوج نے انتہائی چابک دستی' بہادری اور منصوبہ بندی سے عیار دشمن کے چھکے چھڑا دیئے اور سترہ روزہ جنگ میں اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ بری' فضائی اور بحری افواج نے بھارت کو ناقابل تلافی جانی اور مالی نقصان پہنچایا اور دنیا کی جنگی تاریخ میں حیران کن واقعات رقم کیے۔ اس جنگ میں قوم کے جن عظیم سپوتوں نے بہادری کے جوہر دکھائے ان میں ایک روشن نام ائیر کموڈور (ریٹائرڈ) ایم ایم عالم کا بھی ہے جو جنگ ستمبر کے دوران میں پاک فضائیہ میں اسکواڈرن لیڈر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے بہادری کے ایسے لازوال کارنامے انجام دیئے کہ وطن عزیز فتح و نصرت سے سرفراز ہو گیا اور قوم کا سر بھی فخر سے بلند ہو گیا۔ قوم کے بہادر فرزند اسکواڈرن لیڈر ایم عالم نے نہ صرف دشمن کے فضائی حملے روکے بلکہ اپنے عقابی حملوں سے بھارتی فضائیہ کی کمر توڑ کے رکھ دی۔

ایم ایم عالم شروع ہی سے نہایت دلیر اور بہادر تھے۔ آپ قیام پاکستان سے پہلے کلکتہ میں ایک علم پرور گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ ہی میں ایک اردو میڈیم برٹش اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کے والد سرکاری ملازم تھے' چناں چہ 14 اگست 1947ء کو پاکستان قائم ہوا تو والد صاحب کے ساتھ آپ بھی مشرقی پاکستان چلے آئے اور ڈھاکہ میں قیام کیا۔ نیو گورنمنٹ ہائی اسکول ڈھاکہ سے آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ابھی گیارہویں جماعت ہی میں تھے کہ دل میں پائلٹ بننے کا شوق پیدا ہوا۔ خوش قسمتی سے پاک فضائیہ میں آپ کا انتخاب ہو گیا۔ محنت' شوق اور لگن کے باوصف آپ نے اکتوبر 1953ء میں کمیشن حاصل کیا۔ پھر جلد ہی ترقی کر کے پاک فضائیہ میں اسکواڈرن لیڈر کے اہم عہدے پر سرفراز ہو گئے۔ آپ کے اصل جوہر جنگ ستمبر کے دوران میں کھلے۔ آپ نے ایک ہی فضائی معرکے میں صرف دو ہی منٹ میں حیران کن چابک دستی دکھاتے ہوئے بھارتی فضائیہ کے 5 جیٹ لڑاکا طیارے مار گرائے۔ عسکری تاریخ میں یہ ایک بے مثال عالمی ریکارڈ ہے۔

جنگ ستمبر میں آپ نے مجموعی طور پر دشمن کے 11 ہنٹر طیارے مار گرائے۔ یہ معرکہ آپ نے شاہینوں کے شہر سرگودھا کی فضاؤں میں بھارتی فضائیہ سے شدید جھڑپ کے دوران میں سر کیا۔ یوں ایم ایم عالم کی جاں بازی سے پاکستان کو مکمل طور پر فضائی بالادستی حاصل ہو گئی۔ آپ نے مجموعی طور پر اس جنگ میں 36 فضائی حملوں میں حصہ لیا۔ فیروز پور کے قریب دشمن کے دو ہنٹر طیارے اور امرتسر کے قریب بھی دو طیارے مار گرائے۔ ان عظیم کارناموں کے پیش نظر آپ کو "ستارہ جرات" کا اعزاز دیا گیا۔